برطانوی عہد میں مسلمانوں کے مزاحمتی تعلیمی اداروں کے دینی اور تہذیبی کردار کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ایجوکیشن

مقالہ نگار
محمد منیر

نگران
ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی

شعبہ ایجوکیشن

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

اختصاریہ

اسلامی نظامِ تعلیم اسلامی نظامِ حیات کی ایک شاخ ہے۔ یہ نظامِ تعلیم مسلمانوں کے دینی مزاج اور قومی امنگوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں اسلامی نظریہ حیات اسلامی اخلاق اور اسلامی احکام کی تعلیم و تربیت شامل ہے۔ تاکہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنا کردار ادا کریں۔

اٹھارویں صدی میں انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے تو انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو نقصان پہنچایا۔ اس کی جگہ انہوں نے لادینی نظامِ تعلیم ملک میں رائج کیا۔ ایسے نظامِ تعلیم سے مسلمانوں کی بہبود کی توقع رکھنا ہی فضول تھا۔

وہ قوم جس کی بنیاد دین پر ہو اور اخلاق کی استواری دین سے مربوط ہو وہ کیسے انگریزی نظام کو قبول کر سکتی ہے؟ مسلمانوں نے اس نظامِ تعلیم کی مزاحمت کی۔ دارالعلوم دیوبند اس مزاحمتی حصار کی بنیاد بنا۔ دیوبند نے انگریز کی نفسیات کو بھانپ کر اپنا تعلیمی اور دینی کردار ادا کیا۔

دارالعلوم علی گڑھ نے تعلیمی میدان میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ وضاحت کے محتاج نہیں۔ یہ ہمہ وقت سیاسی اور علمی تحریک تھی۔ مسلمانانِ برصغیر میں تعلیم کے حصول کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس تحریک کے بانی سر سیّد احمد خان نے پورے تعلیمی منصوبے کے تحت انگریزی تعلیم کو بطور ڈھال کے استعمال کیا۔ آپ کی سوچ درست تھی۔ آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ کو انگریزی زبان میں محفوظ کیا۔ یہ بھی مزاحمت کا ایک انوکھا اور عاقلانہ انداز تھا جسے اُس وقت کے

اہل دانش پوری طرح نہ سمجھ سکے اس تحریک کا مقصد بھی پسے ہوئے مسلمانوں کو معاشی طور پر آسودہ بنانے کے وسیلے سے انگریز اور ہندو کی منفی سوچ کے خلاف مزاحمت ہی تھا۔

ندوۃ العلماء کی مساعی یقیناً مزاحمت کا متوازن اور نسبتاً ملائم انداز تھا۔اس تحریک نے جدید اور قدیم علوم کے امتزاج سے ایسا نظام مرتب کیا جو دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کی خصوصیات کا امین ثابت ہوا۔

جامعہ ملیہ نے مسلمانوں کو علمی ونظری فضا سے نکال کر عملی تعلیم کے ماحول میں زندگی کو زیادہ سے زیادہ مفید اور فعال بنایا۔مزاحمتی سطح پر مسلمانوں کی تہذیب، ثقافت اور تعلیم کے بچاؤ میں پیش پیش رہا۔برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے تکنیکی میدان میں کام کرنے کی ترغیب کے سلسلے میں اس ادارے کی حیثیت pioneer کی سی بنتی ہے۔

ان اداروں کی مزاحمت کے نتیجے میں برصغیر کے طول وعرض میں بے شمار مزاحمتی ادارے معرضِ وجود میں آئے۔مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مدرسہ مظہر العلوم کراچی، مدرسہ دالرشاد پیر جھنڈا اور مدرسہ امینیہ وغیرہ نے دارالعلوم دیوبند کی تقلید کی۔

مشرقی علوم کے اداروں میں اورینٹیل کالج لاہور اور انجمن پنجاب لاہور، اردو ذریعہ تعلیم کے اداروں میں دہلی کالج، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مدرسہ طبابت حیدرآباد۔اس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام، انجمن الاصلاح کلکتہ، انجمن اسلامیہ کلکتہ، انجمن معید الاسلام دہلی، انجمن ہدایت الاسلام دہلی، انجمن صفتہ الاسلام حیدآباد دکن، انجمن اسلامیہ آگرہ، انجمن کشمیری مسلمانان لاہور، انجمن اصلاح وترقی سادات رضویہ امروہہ، انجمن خواتین
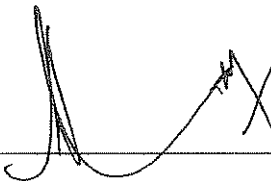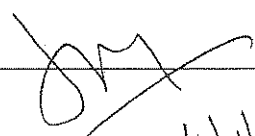
امراوتی دارالعلوم علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے نقیب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم انہی کے دم سے اپنی اقدار پر نازاں ہیں۔

اس تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں ہم پاکستانی نظام تعلیم کے لئے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں مملکتِ خداداد پاکستان میں آج اس قسم کی مزاحمت کی ضرورت تونہیں جو انگریزوں کے زمانے میں تھی۔ تاہم آج اُن مزاحمتی اداروں کے مثبت اور مفید اثرات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پاکستانی نظام تعلیم اور خصوصاً دینی اداروں کی تعلیمات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

تحقیقی مقالہ بعنوان:

''برطانوی عہد میں مسلمانوں کے مزاحمتی تعلیمی اداروں کے دینی اور تہذیبی کردار کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ''

کو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کی جائزہ کمیٹی نے پی ایچ ڈی ایجوکیشن کی ڈگری کے لئے منظور کیا۔

1- سپروائزر

2- ممبر

3- ممبر

اعترافات

اس مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں سب سے پہلے خدائے بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کی رحمتِ بیکراں اور فضل و عنایت کی بدولت یہ مقالہ پایہء تکمیل تک پہنچا۔

اس کے بعد اپنے گائیڈ ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے گونا گوں مصروفیات کے باوجود میری علمی اعانت فرمائی۔ جس پر میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی صاحب نے اس تحقیق کی تکمیل کے سلسلہ میں اپنی علمی فضیلت اور تحقیقی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے میری رہنمائی فرمائی۔ میں ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

برادرم ملک عاشق محمد صاحب کے لئے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ انہوں نے میرے اندر علم و تحقیق کے جذبے کو کبھی ماند نہیں پڑنے دیا۔ اور قدم قدم پر میری مدد کرنے کے لئے مالی اعانت سے کبھی گریز نہ کیا۔

پروفیسر عمر دین قادری صاحب گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان، پروفیسر حافظ اشفاق حسین خان صاحب گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان، محمد اطہر قریشی صاحب گورنمنٹ مسلم ہائی سکول ملتان کی زبان و بیان کے حوالے سے معاونت پر تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

سجاد احمد لاڑ صاحب، اسسٹنٹ لائبریرین ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان ، لائبریرین ، ایم سی لائبریری ، قلعہ کہنہ قاسم باغ ، ملتان ، رب نواز صاحب ، اسسٹنٹ لائبریرین ، باغ لانگے خان ، ملتان ، محمد اکرم صاحب لائبریرین ، گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج ، رنگیل پور ، ملتان ، رشید قیصرانی صاحب ، لائبریرین ، گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ، ملتان ، ملک اسلم ناصر صاحب ، لائبریرین ، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ، ملتان ، محمد یسٰین صاحب ، اسسٹنٹ لائبریرین ، گورنمنٹ علمدار حسین اسلامیہ کالج ، ملتان ، محمد یسٰین ، منتظم ، عبدالرحمٰن اورینٹل لائبریری ، قاسم پور ، ملتان ، علاوہ ازیں جملہ سٹاف لائبریری انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ، قائد اعظم لائبریری ، لاہور ، لائبریری ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد (ملتان ریجن) سنٹرل لائبریری ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان ، پروفیسر فضل الٰہی سیال ، گورنمنٹ کالج کروڑ لعل عیسن / لیہ ، کا تہہِ دِل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے کتب کی فراہمی اور تحقیقی مواد کے حصول میں بطورِ خاص مدد فرمائی۔

میں اپنے مخلص رفقاء کار میاں غلام مصطفیٰ سیال صاحب ، شوکت حسین بھٹہ ، احمد دین سعودی صاحب گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے تحقیقی مواد کے حصول کے سلسلے میں اور مقالے کی تکمیل کے لئے منزل کو میرے لئے آسان کیا۔

شعبہ اردو کے جمیل قریشی صاحب اور عبدالعزیز صاحب ، کمپیوٹر آپریٹر ، ڈین آفس ، کلیہ علوم اسلامیہ السنہ ، بہاء الدین زکریّا یونیورسٹی ملتان کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے کمپوزنگ میں رفتار اور معیار دونوں کو قائم رکھا۔

م ۔ م

فہرست

باب اوّل

تعارف

ہر قوم اور ہر معاشرے میں تعلیم ایک مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ اس کا تعلق ہمیشہ کسی خاص قوم کے نمو اور بقا سے ہوتا ہے۔ قوموں کے معاشرتی حالات اور ضروریات ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کا اپنا الگ نظام تعلیم ہوتا ہے۔ جس میں معاشرے کے حالات میں تبدیلی آنے کے ساتھ ساتھ خود بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ پس کسی قوم کو تعلیم دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اس کے معاشرتی حالات اور ضروریات کا پورا پورا علم ہو اور یہ معلومات ہمیں عمرانیات بہم پہنچاتی ہے۔ تعلیم کو نہ معاشرے اور معاشرتی تغیر سے جُدا کیا جاسکتا ہے نہ یہ زندگی کے متعلق مذہبی اور فلسفیانہ نظریوں سے بے نیاز رہ سکتی ہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی فکر کے ارتقاء میں مذہبی (کسی قدر فلسفیانہ بھی) معاشرتی اور نفسیاتی تینوں عوامل بیک وقت کارفرما ہیں۔ جن میں اساسی حیثیت مذہبی عوامل کی ہے۔ پروفیسر بختیار حسین صدیقی (1983، ص ص ح۔د) لکھتے ہیں:

> ''اسلام کا نصب العین تقویٰ کی بنیاد پر انفرادی نشو ونما کے ساتھ ساتھ احترامِ آدمیت کی بنیاد پر رنگ، خون اور نسل کے امتیازات سے پاک ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں

حریت، مساوات اوراخوت کا بول بالا ہو۔ اسی نصب العین کا
حصول تعلیم کی اصل غایت ہے۔''

آزادی سے قبل مسلم ہندوستان میں یکے بعد دیگرے چار تعلیمی تحریکوں نے جنم لیا۔ دیوبند، علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملّیہ ۔ پہلی تحریک نے ثقافتی عصبیت کو فروغ دینے کے لئے دیوبند میں ایک اسلامی دارالعلوم کھولا۔ دوسری نے اس کے برعکس ثقافتی اثر پذیری کا راستہ اختیار کیا اور مغربی علوم کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں ایک کالج کھولا۔ ایک نے قومی ثقافت کی حفاظت کی، دوسری نے معاشرتی تغیر کے لئے راہ ہموار کی ۔ ندوۃ العلماء نے ان دونوں تحریکوں کو آپس میں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ۔ دینی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور سائنسی علوم کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا۔ لیکن بعض وجوہ سے اس پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمہ پہلو شخصیّت نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ اس نے نہ صرف مسلمانوں کے قومی تشخّص کو قائم رکھا بلکہ مغربی علوم وفنون سے بھی استفادہ کیا، پرائمری سطح پر جان ڈیوی کے مجوّزہ طریقِ تعلیم ۔ ثانوی سطح پر ڈالٹن پلان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر سطح پر ہر مضمون میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ انگریزی تسلّط اور انگریزی تہذیب کے اثرات نے جب مسلمانوں کی تعلیم پر اثر ڈالا، تو چند علمی طبقے ان اثرات کے خلاف مزاحمت کے انداز میں انقلابی سوچ کے ساتھ اُبھرے۔

مزاحمت سے مراد کسی فرد، ادارے، تنظیم یا تحریک کے اثر کو روکنا ہوتا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں انگریز حکمرانوں نے انتظام وانصرام کو چلانے کے لئے مختلف پالیسیاں بنائیں ۔ ان کی

سیاسی اور انتظامی حکمت عملی میں یہ بات خاص اہمیت رکھتی تھی کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور نظریاتی اساسیات کو متزلزل کیا جائے۔ اس طرح ان کا مقصد ہندی مسلمانوں کے تشخص کو کمزور یا ملیامیٹ کرنا تھا تا کہ یہ طبقہ دوبارہ طاقتور بن کر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کیلئے کبھی کوشش نہ کر سکے۔ اسی لئے انگریزوں نے ایسا نظام تعلیم متشکل کیا جو مسلمانوں کو انگریز ذہن دے اور انہیں ان کے مذہب، انکی تہذیب وثقافت سے دُور کرے۔ یہ بات مسلمانوں کے مذہبی اور علمی گروہ کو ناپسند تھی اور انہوں نے انگریزوں کے تعلیمی اثر ونفوذ کو کم یا ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مختلف اشخاص، گروہوں اداروں اور تنظیموں نے یہ مزاحمتی کردار اپنے اپنے انداز میں ادا کیا۔ مزاحمت کی صورتیں یہ رہیں:

1- انگریزوں کے تعلیمی نظام کی مکمل طور پر مخالفت کی جائے اور کسی بھی حالت میں اسے قبول نہ کیا جائے۔

2- انگریزوں کے تعلیمی نظام کے مثبت پہلوؤں کو اپنایا جائے اور صرف منفی پہلوؤں کی بھرپور مخالفت کی جائے۔

3- انگریزوں کی عظیم سیاسی قوّت کا احساس اور ادراک کرتے ہوئے مصلحت سے کام لیا جائے۔ مسلمانوں کو پہلے منظّم اور تعلیم یافتہ قوم بنایا جائے اور پھر انگریزی نظام تعلیم کے خلاف مزاحمت کا علم بلند کیا جائے۔

مزاحمت کی صورت کوئی بھی ہو، مقصد ایک تھا اور وہ مقصد انگریز کی تعلیمی حکمت عملی کے اثر کو کم یا ختم کرنا اور مسلمانوں میں تنظیم، ترتیب اور اہلیت وقابلیت پیدا کرنا تھا تا کہ وہ برصغیر میں

عزت کے ساتھ جی سکیں اور ماحول میں سر اٹھا کر چل سکیں۔ پروفیسر خورشید احمد (1977، ص 79) لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کا اصل اعتراض یہ تھا کہ نئی تعلیم اپنے مزاج، اپنے مقاصد، اپنے نصابِ تعلیم اور اپنے اجتماعی ماحول کے اعتبار سے دین اسلام اور اسلامی ثقافت سے کاٹنے اور دُور لے جانے والی چیز تھی۔''

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد شاہجہان کے دَور میں ہوئی اور ان کا دَورِ حکومت دراصل 1757ء میں، جنگ پلاسی میں کامیابی کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ اور انہوں نے 1947ء تک برصغیر پر حکمرانی کی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگریز کے نظام تعلیم کا بنیادی مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا اور اس کا اہم ذریعہ مشنری تعلیمی ادارے تھے۔ ڈاکٹر این۔این۔لاء (1972، ص 28) لکھتے ہیں:

> ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے وسائل سے ایسے ضروری اقدامات کئے گئے جن کا مقصد ہندوستان کو بائبل کی تعلیم کے لئے تیار کرنا تھا۔ ان یورپین نوواردوں کا بنیادی مقصد مسیحیت کی تبلیغ تھا۔ اس بات کا اعتراف کمپنی کے جاری کئے ہوئے ابتدائی فرامین میں ملتا ہے۔ ان فرامین میں مسیحی تعلیم کی طرف اشارہ تھا۔ 1930ء کے بعد واضح طور پر اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے گورنمنٹ کی خواہش کا پتہ چلتا ہے۔''

1835ء کا سال تعلیم کی تاریخ میں اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب مشہور ماہر قانون لارڈ میکالے نے اپنی تاریخی یادداشت پیش کی جس کی روشنی میں 7 مارچ 1835ء کو تعلیمی پالیسی کا اعلامیہ منظور کیا گیا۔ اسی پر ملک کی تعلیم کا ڈھانچہ بنایا گیا۔ انگریزوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد لارڈ میکالے کے حوالے سے سیّد شبیر بخاری (1986، ص45) لکھتے ہیں:

> ''فی الوقت ہماری بہترین کوششیں ایک ایسا طبقہ معرضِ وجود میں لانے کے لئے وقف ہونی چاہیں جو ہم میں اور کروڑوں انسانوں کے مابین جن پر حکومت کر رہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ انجام دے۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز ہو۔''

گویا ہندوستان میں تعلیم کا اصل مقصد یورپی ادب اور سائنس کا فروغ قرار پایا۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ خزانے کی تمام رقوم اسی قسم کی تعلیم پر خرچ ہونے لگیں اور تعلیم کو کلرکوں کی فراہمی کا کام سونپ دیا۔ جن مدارس میں صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی انہیں بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ ان کے فارغ التحصیل طلبہ پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دئے گئے۔ سیّد طفیل احمد منگلوری (1971، ص15) لکھتے ہیں:

> ''علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے۔ ہند میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعل سازی کے جرائم بڑھ

رہے ہیں اور سفارش کی کہ متعدد کالج قائم کیے جائیں اور تعلیم
پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔''

برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں 1838ء خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسی سال مشرقی ہند میں مسلمانوں کے اوقاف، کمپنی نے اپنے قبضے میں لے لئے اور ان کی آمدنیوں کے مصارف، جو دینی مدارس پر ہوتے تھے، کو اس سے کاٹ کر انہیں اپنی موت آپ مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی تعلیمی بربادی اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو ضبط کرنے کے متعلق مولانا سیّد حسین احمد مدنی (1998، ص162) لکھتے ہیں:

''انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت
اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت کو فنا کر دیں گے
اس لئے انہوں نے تعلیم گاہوں کو ملیامیٹ اور تعلیم کو نیست
و نابود کر دیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو 1838ء میں
سرکاری قبضہ میں لے لیا۔''

مینگلس نے 1857ء کے آغاز میں ''دارالعوام'' میں جو تقریر کی، اس سے انگریزوں کی ذہنیت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں عیسائیت کے پرچار کے بارے میں انگریزوں کی کاوشوں کے متعلق منظور احمد جاوید بحوالہ مینگلس (1979، ص64) لکھتے ہیں:

''خداوند نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت،
انگلستان کے زیرنگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا، ہندوستان
کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی

تمام تر قوت سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لئے عظیم
الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے اور اس میں کسی
طرح کا تساہل نہیں ہونا چاہئے۔''

مغربی افکار ونظریات کی یلغار کے بارے میں محمد اسحٰق بھٹی (1974،ص82) لکھتے ہیں:

''جب برصغیر پاک وہند پر فرنگی سامراج نے اپنے اقتدار کو
مستحکم کرلیا،تو مغربی افکار ونظریات کی یلغار شروع ہوگئی۔نتیجہ
یہ کہ ہمارا رشتہ ماضی سے کٹ گیا۔تہذیبی ، ثقافتی ، اخلاقی و
دینی اقدار کو تباہ وبرباد کرنے میں نئے آقاؤں نے کوئی کسر
باقی نہ چھوڑی۔''

1857ء کے بعد انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں پشاور سے راس کماری تک اور بلوچستان سے برما تک پھیل گئی۔اتنی وسیع سلطنت کے مالک، برصغیر میں ایسی تعلیم چاہتے تھے جو انگریز کی ہر حال میں وفادار پیدا کرے اور ہندیوں کو مغربی تہذب کا پرستار بنادے ہندوؤں کی اکثریت کے لئے ایسی جدید تعلیم قابل قبول تھی لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ تعلیم کے لئے تعلیم کے ذریعے اسلامی تربیت کا کام انجام دینے پر مُصر تھا۔وہ اسلامی تہذیب کی بقا کی غرض سے مدارس کا روایتی نظام برقرار رکھنا چاہتا تھا اور اپنے اسلاف کے علم کو نئی نسلوں تک بغیر آمیزش کے منتقل کرنا چاہتا تھا۔ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی (1993،ص ص 163۔162) لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے دن بدن بڑھتے ہوئے غلبہ کے پس منظر میں
بنگال کے مسلمان (سب سے پہلے) یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے
کہ اُن کا دین وایمان اور اُن کی اسلامی تعلیمات وروایات

غیر محفوظ ہیں۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے دینی تعلیم کی ترغیب اور
مذہب کے تحفظ کے لئے ایک اسلامی تعلیمی ادارے کے قیام
کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا"

بنگال سے اٹھی ہوئی مزاحمت کی یہ لہر، برصغیر کے کونے کونے تک پہنچی ۔ دارالعلوم دیوبند، مزاحمتی تعلیمی اداروں کے سرخیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں مرکز علی گڑھ نے تعلیم جدید کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم وتہذیب کی حفاظت پر زور دیا اور ندوۃ العلماء لکھنو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی اور مدرستہ الاصلاح سرائے میر نے درمیانی راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا وہاں دیوبند نے اسلام دشمن فضا میں پوری طرح مزاحمت کا عزم کیا،جس کی کئی صورتیں سامنے آئیں۔ڈاکٹر مبارک علی (1986 الف،ص284) لکھتے ہیں:

"اوّل عملی زندگی سے فرار اور مذہب وتصوف میں پناہ، دوم،
برطانوی اقتدار کی مخالفت اور مزاحمت، سوم، انگریزوں کی ہر
چیز سے نفرت اور اپنے ماضی کی روایت پر فخر۔"

—— اس کے اتباع میں مظاہر العلوم سہارن پور، قاسم العلوم مراد آباد، مظہر العلوم کراچی، مدرسہ امینیہ اور مدرسہ فتح پور دہلی، مدرسہ تقویۃ الاسلام امرتسر، دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا، حیدر آباد کے علاوہ صوبہ بنگال کے متعدد دینی مدارس نے مزاحمتی کردار ادا کیا۔ اس مزاحمت میں سینکڑوں دینی ادارے،علوم مشرقی کے ادارے اور اُردو ذریعہ تعلیم کے اداروں نے متحد ہو کر کام کیا۔

برصغیر میں انگریزوں کے تسلّط کے بعد تعلیم کا جو دَور شروع ہوا وہ فی الحقیقت جدید علوم وفنون کی تعلیم کا دَور ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی نئے نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا، ہمیشہ اسکے خلاف نت نئے انداز سے مزاحمت کرتا رہا۔ ان اداروں کی مزاحمتی خدمات کی بدولت جو مثبت

نتائج اور اثرات برآمد ہوئے ان کے متعلق ابوسلمان شاہ جہاں پوری (74-1973، ص 23) لکھتے ہیں:

''ان اداروں کی بدولت ملت اسلامیہ کو لاکھوں فرزند ایسے میسر آ گئے جنہوں نے حالات وواقعات کے مطابق زندگی کے مختلف گوشوں میں ملت کی رہنمائی کی، مسلمانوں کا احساسِ کمتری دُور ہوا۔ بہت سے سیاسی رہنما اور مدبر بیدار ہوئے۔ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا اور آگے چل کر تحریک پاکستان کو ان کی بدولت قوت اور رہنمائی نصیب ہوئی۔''

مسئلے کا بیان

اس تحقیق کا مقصد ''برطانوی عہد میں مسلمانوں کے مزاحمتی تعلیمی اداروں کے دینی اور تہذیبی کردار کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ'' کرنا تھا۔

تحقیق کے مقاصد

1- اسلامی نظام تعلیم کا تجزیہ کرنا۔
2- برصغیر کے لئے برطانوی تعلیمی نظام کا تجزیہ کرنا۔
3- برطانوی نظامِ تعلیم کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل کا جائزہ لینا۔
4- دارالعلوم علی گڑھ کے مفاہمتی تعلیمی وثقافتی کردار کو واضح کرنا۔
5- دینی اداروں کی مزاحمت کی نوعیت واضح کرنا۔
6- علوم شرقی کے اداروں کی تہذیبی کوششوں کا تجزیہ کرنا۔

-7 علوم شرقی کے اداروں کی اُردو نواز پالیسیوں کا جائزہ لینا۔

-8 مزاحمت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کرنا۔

-9 مسلمانوں کی مابعد تعلیمی تاریخ پر، مزاحمتی اداروں کے اثرات کا جائزہ لینا۔

تحقیق کی اہمیت

اس تحقیق کی تکمیل سے درج ذیل اُمور معاون ثابت ہوں گے:

-1 دینی تعلیم کے اداروں اور دُنیوی علوم کے اداروں کے فارغ التحصیل حلقوں کے درمیان موجود نظریاتی بُعد کو کم کیا جاسکے گا۔

-2 پاکستانی دینی مدارس میں نصاب، طریقہء تدریس اور نظامِ جائزہ کی تعمیر نو کے سلسلے میں مثبت سوچ پیدا ہو سکے گی۔

-3 مزاحمت کے مثبت پہلوؤں کو اپنانے سے دینی مدارس کے مشن کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔

-4 مزاحمت کے منفی پہلوؤں سے احتراز کرنے سے متوازی نظاموں کے درمیان فاصلہ کم ہوگا۔

-5 قدیم دینی مدارس کے ایجابی عناصر کی عملی صورت گری، عام تعلیمی اداروں میں مناسب حد تک کی جاسکے گی۔

-6 موجودہ دینی مدارس میں افادی اور دُنیوی علوم کا پیوند لگا کر، ان اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ کو معاشرے کی ''Main stream'' میں لایا جاسکے گا۔

-7 مستقبل کے محققین کے لئے مزید تحقیق کا راستہ کُھلے گا۔

تحدیدات

1- تحقیق کو برطانوی عہد تک محدود رکھا گیا ہے۔
2- صرف شمالی ہند کے مزاحمتی تعلیمی اداروں کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔
3- صرف دینی اور علوم شرقی کے اداروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔
4- مذہب اور ثقافت (صرف دو عناصر) کے تحفظ کے لئے مزاحمت کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔
5- مزاحمت کے ایجابی اور سلبی پہلوؤں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

طریق تحقیق

زیرِ نظر تحقیق اپنے موضوع کے اعتبار سے تاریخی تحقیق کے زمرے میں آتی ہے۔ اس تحقیق میں برطانوی عہد میں مسلمانوں کے مزاحمتی تعلیمی اداروں کے دینی اور تہذیبی کردار کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کی تکمیل کے لئے مواد کے جمع کرنے کے سلسلے میں پرائمری وسائل تک رسائی نہیں تھی۔ اس لئے ثانوی وسائل (مختلف کتب، وسائل، میگزین اور اخبارات) کے مطالعہ سے مواد حاصل کیا گیا۔ محقق نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ مستند مصنفین کی کتب سے استفادہ کیا جائے اس لئے اُن کے حوالہ جات متعلقہ مواد میں شامل کئے گئے ہیں۔ مواد کی چھان پھٹک کی گئی اور مواد کو یکجا کر کے رپورٹ کی شکل دی گئی ہے۔ رپورٹ کے حاصلات کی بنیاد پر قابل عمل سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔

مطالعہ کی تنظیم

باب اوّل تحقیق کے تعارف سے متعلق ہے۔ اس میں تحقیق کے پس منظر، جواز، مقاصد،

اہمیّت اور تحدیدات کے بارے میں مختصر جائزہ شامل ہے۔

باب دوم میں اسلامی نظام تعلیم کے ترکیبی عناصر، مقاصد تعلیم، نصابِ تعلیم، طریق تدریس اور نظام جائزہ کو تاریخی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں معلم اور متعلّم کے تعلقات اور مسجد کے کردار کے حوالے سے اسلام میں تعلیم کی اہمیت وضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔

باب سوم میں برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کے معیّنات کے طور پر تعلیمی مقاصد، انگریزی زبان کی ترویج، مغربی ثقافت کا نفوذ، جدید علوم وفنون کی ترسیل اور عیسائیت کے پرچار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے دینی اور تہذیبی کردار کے حوالے سے چار اَدوار، غزنوی عہد، سلاطین دہلی کا عہد، مغلیہ عہد اور برطانوی عہد کے نمائندہ اداروں کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

باب پنجم مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے مزاحمتی کردار سے متعلق ہے۔ جس میں مزاحمت کی اہمیت و ماہیت بیان کی گئی ہے اور دار العلوم علی گڑھ ___ انگریزوں سے مفاہمت کی مثال مزاحمت کے روپ میں بیان کی گئی ہے اور دینی تعلیمی اداروں کی مزاحمت کو زیر بحث لایا گیا ہے نیز مزاحمت کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب ششم خلاصہ وسفارشات پر مشتمل ہے جس میں تحقیقی عمل کو اختصار سے پیش کیا گیا ہے اور قابلِ عمل سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔

آخر میں مستقبل کے محققین کی رہنمائی کے لئے چند سفارشات دی گئی ہیں تاکہ اُن کی روشنی میں آئندہ ہونے والے تحقیقی کام کو آگے بڑھایا جاسکے۔

تعریفات

اِس مقالے میں مختلف اصطلاحات جن مفاہیم میں استعمال کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

مزاحمت:۔ مزاحمت سے مراد کسی فرد، ادارے، تنظیم یا تحریک کے اثر کو روکنا ہوتا ہے۔

مزاحمت کا مثبت پہلو:۔ تعلیم سے پھیلنے والی بیداری، آزادخیالی اور تنقید کی صلاحیت، جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں مزاحمت کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی۔

مزاحمت کا منفی پہلو:۔ جدید علوم وفنون کے بارے میں کمزور نقطۂ نظر کو مزاحمت کا منفی پہلو کہا گیا ہے۔

علوم شرقی کے ادارے:۔ علوم شرقی کے اداروں سے مراد مشرقی زبانوں کے ادارے ہیں۔

کلچر، ثقافت:۔ اُن لوگوں کا انداز زندگی ہے جو کسی خاص مقام یا ملک میں اکٹھے رہتے ہوں یہ کلچر اُن کے آرٹس، رسوم وتقریبات، عادات اور مذہب میں نظر آتا ہے۔

'Main Stream':۔ ''مرکزی دھارا'' کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

ثقافتی عصبیت:۔ معاشرے اور اس کی ثقافت کا تحفظ جو چیز کرتی ہے، وہ ثقافتی عصبیت کہلاتی ہے

ثقافتی اثر پذیری:۔ ایک ثقافت کا دوسری ثقافت پر اثر یا تغیر کے لئے راہ ہموار کرنے کو ثقافتی اثر پذیری کہتے ہیں۔

باب دوم

اسلامی نظامِ تعلیم کے ترکیبی عناصر

اِسلامی نظامِ تعلیم سے مراد ایسا نظامِ تعلیم ہے جو انسانی معاشرے کو عدل و انصاف، حق شناسی اور پاکیزگی کے اعتبار سے بلند و بالا کرتا ہے۔ اِسلام وحدت نسلِ انسانی، مذہب اور تعمیر انسانیت کا داعی ہے۔ اسلام تعلیم کے ذریعے دینی اور دُنیوی بہبود حاصل کرنے کی ہدایت کر کے تکمیلِ حیات کا بندوبست کرتا ہے۔ اسلام میں تعلیم کا تصور اس لحاظ سے جاندار متحرک اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے کہ وہ زمینی زندگی میں کامیابی کے لئے جدوجہد کرنے، اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے محنت کرنے اور کائنات کے سربستہ رازوں کو آشکار کرنے کے لئے پیہم کوشش کرنے کے نہ صرف حق میں ہے بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے۔ غلام عابد خان (1986، ص ص 63-62) لکھتے ہیں:

> ''انسانیت کی ایسی تعمیر نو کی جائے جس سے خدا کی مخلوق سے محبت اور دوسروں سے رواداری جیسی صفات پیدا ہوں تا کہ پوری انسانیت ایسے معاشرے کو تشکیل دے سکے جو ہر لحاظ سے پُر امن بقائے باہمی کے اصول کو اپنا کر خوشحال زندگی گزار سکے تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔''

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جہاں نصابِ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے، وہاں طرزِ

تعلیم کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارا نصابِ تعلیم ایسا ہو، جس سے فن کے ماہرین اور قابل افراد پیدا ہوں، کیونکہ اسلام کی تعلیم میں ایک اہم قاعدہ یہ ہے، کہ انسان جس کام کو کرے، اسے نہایت خوش اسلوبی سے کرے۔ تعلیم و تعلّم ہر آدمی کے کئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا تہذیب و اخلاق۔ جب تک انسان علُوم و فنون مروّجہ سے نابلد رہتا ہے اُس میں نہ بصیرت پیدا ہوسکتی ہے اور نہ صحیح عقل و شعور! علوم فنون کے حصول کے متعلق نادؔم سیتاپوری (1971، ص199) لکھتے ہیں:

> ''علُوم فنون کے حصول ہی سے عقل و شعورِ انسانی کی جِلا ہوتی ہے اور انسان اپنی تمام دینی و دُنیوی ضروریات پر قابو پا سکتا ہے۔''

یہ علوم و فنون ایسے ہونے چاہئیں، جن کی ملک اور قوم کو واقعی ضرورت ہو اس لئے نہیں کہ وہ ہمیں غلامی کی وراثت میں ملے ہیں، یا فلاں ملک میں پڑھائے جاتے ہیں، پھر ان علوم و فنون میں کمال اور مہارت حاصل کرنے کے لئے جو بھی ممکن ذرائع ہوں، انہیں بروئے کار لانا ضروری ہے وگرنہ اس کے مطلوبہ نتائج ظاہر نہیں ہوں گے۔ دینی علوم و فنون کے متعلق ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر الازہری (1979، ص449) لکھتے ہیں:

> ''دین ہماری زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے اور یہ دین ہماری بنیادی ضرورت ہے اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہمارے پاس اچھے ماہرین علماء کی ضرورت ہے جو ایک طرف دین کی حفاظت کریں اور دوسری طرف مسلمان معاشرے کے دینی مسائل کو حل بھی کریں اور نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کا نصوص شرعیہ کی روشنی میں حل بھی پیش کرسکیں اور ظاہر ہے کہ ایسے علماء تب ہی ہونگے جب ان کے

لئے نصابِ تعلیم خاص ہو اور یک سوئی کے ساتھ اپنی پوری قوت اس کے حاصل کرنے میں صرف کریں۔''

اس بیان کی مزید توضیح کے لیے ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983، ص ص 273-272) لکھتے ہیں:

''اسلامی نظامِ تعلیم سے مراد ایسا تعلیمی نظام ہے، جس میں ایک مسلمان بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے خاص علم وفن میں مہارت اور قابلیت حاصل کرنے کے ساتھ ایک اچھا مسلمان بھی بنے، جس کا قلب ایمان اور تقوی سے سرشار ہو، ضروری عقائد سے واقف ہو۔ ضروریات دین اور فرائض کا علم رکھتا ہو اور اسلامی اعمال و اخلاق کا صحیح نمونہ ہو۔ اگر کسی نے اپنے لئے طب کا پیشہ اختیار کیا ہے تو وہ اپنے فن میں ایک مسلمان ڈاکٹر کا کردار ادا کرے اور اگر اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا ہے تو وہ اپنی تجارت میں ایک مسلمان تاجر کا رول ادا کرے اور اگر اس نے اپنے لئے ایک فوجی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ اپنی عسکری زندگی میں ایک مسلمان مجاہد کا کردار ادا کرے۔ اس طرح زندگی کے جس شعبے سے اس کا تعلق ہو، بحیثیت مسلمان اپنا فرض انجام دے، اس لئے کہ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کچھ احکام و آداب بیان کئے ہیں۔''

ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983، ص 273) مزید لکھتے ہیں:

''وہ نظامِ تعلیم جس کے ذریعے ان تمام امور واشیاء سے آگاہی اور واقفیت حاصل ہوسکتی ہے، جس کا انسان کی اُخروی اور دُنیوی فوز وفلاح سے تعلق ہو، اس فوز وفلاح سے جو اسلام چاہتا ہے ....اُخروی فوز وفلاح کا مطلب ہے انسان کا جہنم کے عذاب سے بچ جانا اور جنت کی نعمتوں کا پالینا اور دنیاوی فوز وفلاح کا مطلب ہے انسان کا اپنی طبعی عمر تک امن واطمینان کے ساتھ زندہ رہنا اور اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق ارتقاء کے اس درجے تک پہنچنا، جو اُس کے لئے مادّی اور روحانی طور پر ممکن ہے۔''

مقاصد تعلیم

علم کی اہمیت کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مقاصد کا تعیّن قرآن کے حوالے سے یوں ہے:

''بے شک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے اُن کے پاس انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو انہیں اسکی آیات سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت سکھاتا ہے۔'' (آل عمران:164)

ارشادِ نبویؐ ہے کہ:

''اس مسلمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو نہ استاد ہو اور نہ طالب علم''

(محاضر الادباء)

''بلا تاخیر ایک جاہل کو علم کی تلاش میں لگ جانا چاہیئے اور ایک مُتبحّر عالم کو اپنے علم میں اضافہ کرنے میں۔''

(احیاء العلوم)

''تلاش علم ایسا ہی مقدس کام ہے، جیسے عبادت اور اس کے حصول میں جو مصیبت اٹھائی جائے وہ جہاد ہے۔''

(کشف الظنون)

ان احکام کی روشنی میں مقصد کا تعیّن ہو جاتا ہے اور جو بات واضح ہو کر قطعیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان کے جاہل رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے اسے علم کی تحصیل میں اس طرح لگ جانا چاہیئے کہ وہ اس کی زندگی کا ایک اہم مقصد بن جائے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنا ایک اہم فرض پورا نہیں کرتا۔ یہاں تک نکتے کی بات صرف اتنی ہے کہ دورِ جدید میں حصولِ علم کے مقتضیات کیا ہیں؟

کیا اسلام حصولِ علم کا مخالف ہے؟ کیا ماضی میں علم و ہنر کی ترویج پر کوئی پابندی لگائی گئی تھی؟ کیا حال میں حصولِ علم پر کوئی پابندی ہے؟ اگر اس نکتے کی منطقی صراحت کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسلام نہ صرف یہ پابندی نہیں لگاتا بلکہ اسے عبادت تصور کرتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل مغرب اور مغرب نواز طبقے کی یہ غرض کس لئے؟ بظاہر اس تناؤ اور آتش مزاجی کا کوئی سبب نظر نہیں آتا سوائے اس بات کے کہ اسلام اور اس رشتے سے مسلمان کے پیشِ

نظر علم کی تحصیل کا سب سے بڑا مقصد صفائی قلب ونظر اور معاشرتی اور اخلاقی انضباط ہے اور شاید یہی بات اُنہیں اچھی نہ لگتی ہو۔ ایک مسلمان اسی دائرے میں رہ کر علم کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983، ص268) کے خیال میں:

''حصولِ علم اور انضباطی پابندیوں سے کوئی ٹکراؤ نہیں ایک کیمیا دان، ایک مہندس، ایک طبیب اور ایک ماہر طبعیات اپنے علم میں اختصاص بھی پیدا کر سکتا ہے اور اسلامی اقدار کا پابند بھی رہ سکتا ہے نہ اس میں کوئی تنازع ہے اور نہ ٹکراؤ۔''

تعلیم کے مقاصد کا تعیّن کئے بغیر تعلیم کے ثمرات کا حصول ناممکن ہے جیسے منزل کا تعیّن کئے بغیر راستے پر چلنا فضول عمل ہے۔ تعلیم وتدریس ایک سنجیدہ عمل ہے، جس کا تعلق افراد اور اقوام کی بقا سے ہے۔ اگر تعلیم کے مقاصد کا تعیّن ہی نہ کیا جائے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ فرد اور سماج دونوں کی محنت اور کاوش پر پانی پھر جاتا ہے۔

علم کو مسلمان کرنے کے لئے اسلام نے تعلیمی مقاصد کا واضح طور پر تعیّن کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک تعلیم کا پہلا اور بنیادی مقصد، ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو اسلامی نظریہ حیات کو سمجھتے ہوں، اس نظریہ پر پختہ یقین رکھتے ہوں اور جو اپنی زندگی کو اس نظریہ کے مطابق ڈھال سکیں۔ اسلام علم برائے علم کا قائل نہیں۔ وہ تعلیم کو منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کی منزل، اسلامی نظریہ زندگی کی تفہیم' آگہی اور اشاعت ہے۔ تعلیم ایک طرف مسلمان طلبہ کو اسلامی اصول حیات سے روشناس کرتی ہے تاکہ وہ ان اُصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں تو دوسری طرف انہیں ہدایت دیتی ہے کہ وہ ان اسلامی اصول واقدار کو معاشرے میں پھیلائیں تاکہ سارے ماحول پر الٰہیاتی اور نظریاتی رنگ غالب ہو۔ ڈاکٹر احمد (لسٹر) (1977، ص43) لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھر پور یقین کے حامل ہوں اور اسے ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں۔''

اسلام کے نزدیک تعلیم کا دوسرا مقصد، جو دراصل پہلے مقصد سے مربوط ہے' یہ ہے کہ خدا کی معرفت اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے روشنی اور ہدایت کا سامان فراہم کرے تعلیم کے مقاصد کے حوالے سے منور ابن صادق (1973،ص 7) لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کا بنیادی مقصد ذات باری تعالٰی کی رضا اور معرفت کا حصول ہے۔ اس وجہ سے وہ علوم آخرت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔''

اگر تعلیم نے طالب علم کو یہ احساس دلا دیا کہ وہ زمین میں خدا کا خلیفہ ہے اور اسے خدا کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر خدائی صفات کا مظہر بننا ہے۔ اگر تعلیم نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ عبادت کے وسیع تر مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے، عبودیت کی منزلوں کو طے کرے۔ اگر تعلیم نے اس کے دل میں خوف خدا پیدا کر دیا اور اس نے اپنے اعمال کو تقویٰ کے راستے پر ڈال دیا۔ اگر تعلیم نے طالب علم کے اندر خدا کی شکر گزاری اور احسان مندی کا جذبہ پیدا کر دیا تو سمجھ لیجئے کہ وہ خدا شناسی کی منزل تک پہنچ جائے گا اور پھر اس کے اعمال کا معیار، خدا کی رضا ہو جائے گی اس بارے میں ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی (1993،ص 51) لکھتے ہیں:

''اسلام میں تعلیم کا مقصد انسان اور خدا کے درمیان اس تعلق کو استوار کرنا ہے، جس کے نتیجے میں انسان، بخوشی و خاطر اپنی زندگی کے تمام امور میں خداوندی احکام پر عمل کرتا اور رضائے الٰہی کو اپنی پسند و ناپسند کا معیار ٹھہراتا۔''

اسلام کے نزدیک تعلیم کا تیسرا مقصد، فرد کے کردار کی تعمیر ہے۔ حضورؐ کا بنیادی مشن تزکیہ نفس یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ ''جس شخص نے علم تو زیادہ حاصل کرلیا لیکن ہدایت، تقوٰی اور پرہیزگاری میں اضافہ نہ ہوا۔ تو ایسا شخص اللہ سے مزید دور ہٹ گیا۔'' امام غزالی کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیے کہ نوجوان ذہن علم کی پیاس بجھادے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے مولانا صدرالدین اصلاحی (1990، ص 51) لکھتے ہیں:

''اسلام ایک طرف فرد کی انفرادیت کی تکمیل کرتا ہے تو دوسری طرف اسے معاشرے کا ایک صالح اور مفید رکن دیکھنا چاہتا ہے، جو اپنی صلاحتیوں سے کام لے کر اپنے ماحول کو حسین تر اور صالح تر بنا سکے۔ اس طرح اسلامی تعلیم کا مقصد، انفرادیت اور اجتماعیت میں بہترین توازن پیدا کرنا ہے۔''

اسلام کے مطابق تعلیم کا چوتھا مقصد دین اور دنیا کا توازن اور ارتباط ہے۔ اسلام رہبانیت کو رَد کرتا ہے۔ دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے اس جہاں کو مومن کے لئے کارزار جہاد کہتا ہے۔ اس دنیا سے اپنا حصہ لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

''ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں

کے لئے تخلیق کی ہیں''؟ حضورؐ فرماتے ہیں''اس علم سے اللہ کی پناہ مانگو، جو نفع نہ دے''۔ لیکن نفع سے مراد، مادہ پرستی اور مال کی طمع نہیں۔ اسلام ایسی تعلیم کا قائل ہے، جس کے حصول کے بعد مسلمان، دین اور دنیا کے درمیان توازن پیدا کرلے۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے مفہوم ومطلب کے حوالے سے مولانا محمد طاسین (1979، ص380) لکھتے ہیں:

> ''ایک اسلامی معاشرے کے لئے صحیح نظامِ تعلیم وہ ہوسکتا ہے جس میں روحانی علوم کے ساتھ مادی علوم کے پڑھنے پڑھانے کا بھی پورا انتظام ہو، چنانچہ جو نظامِ تعلیم محض روحانی علوم پر مشتمل ہو، یا محض مادی علوم پر مشتمل ہو مکمل طور پر اسلامی نظامِ تعلیم نہیں کہلا سکتا۔ مکمل طور پر اسلامی نظامِ تعلیم وہ ہوگا جس میں دین ودنیا کے نام پر دو قسم کے علوم نہ ہوں بلکہ تمام علوم دین کے نام پر ہوں اور اِن سب کا مقصد انسانی فوز وفلاح کے اس مقصد کو بروئے کار لانا ہو جو دینِ اسلام نے بتایا ہے۔''

پروفیسر عطش درانی اسلام کے حوالے سے مقاصد تعلیم کو دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں عمومی اور خصوصی:

عمومی مقاصد

- انسان کی روحانی، ذہنی، عقلی، جذباتی اور جسمانی قوتوں کو اس طرح سے جلا بخشنا کہ اس سے شخصیت متوازن ہوجائے۔
- اسلامی نظریہ حیات اور تمدّن وثقافت کی حفاظت کرنا اور اس کی نشو ونما کرنا۔

- انسانوں میں مذہب اسلام کی سچی روح پیدا کرنا اوراس کے لئے انہیں ایک بھرپور زندگی کے لئے تیار کرنا۔
- انفرادیت اوراجتماعیت کے درمیان مطابقت اورتوازن پیدا کرنا۔
- روحانی اور مادی دنیاؤں کے درمیان امتیاز اورتفریق کوختم کرنا۔
- انسان کوعقائد، عبادات اور معاملات میں صحیح ، باضابطہ اور دیانت دارانہ رویّے کی تربیت دینا۔
- فردکومعقول معاش کے قابل بنانا۔
- فردکی تمام تر صلاحیتوں کواجاگر کرنا۔
- فردکواس کی تمام تر صلاحیتوں ، معاش ، رویّے ، امتیازات ،توازن اور بالیدگی ونشوونما کے ساتھ اللہ کا اطاعت گذار بندہ بنانا۔

خصوصی مقاصد

- انسان میں اسلامی نظریہ حیات پرایمان راسخ پیدا کرنا۔
- اطاعت الٰہی کاشعور پیدا کرنا۔
- انسان میں تقویٰ پیدا کرنا اوراس کا تزکیہ نفس کرنا۔
- علومِ دینی ، وصفی ،عمرانی ،طبعی ،فنی اورحرفتی کی تربیت دینا۔
- رزقِ حلال کمانے کی تربیت دینا۔
- انسان کومحنت اور مشقت کا عادی بنانا۔
- اس میں صبر، مستقل مزاجی اوراُولوالعزمی پیدا کرنا۔

- پابندی اوقات، نظم وضبط اور پیش بینی کی عادت ڈالنا۔
- علمی، ادبی ذوق پیدا کرنا، تحریری وتقریری صلاحیتوں کو جلا دینا۔
- صحت منداور توانا افراد بنانا۔
- اسلامی ریاست چلانے کے لئے افراد تیار کرنا۔
- اسلامی معاشرے کے فروغ کے لئے اصحاب صلاحیت تیار کرنا۔
- استحکام معاشرہ کے لئے معیارِ اخلاق بلند کرنا۔

تعلیم کا مقصد صرف کتابی تعلیم نہیں بلکہ انکشافات اور حقائقِ حیات کو نسلاً بعد نسلاً منتقل کرنے اور تلاش حق کا سلسلہ لا متناہی پیہم جاری وساری رکھنے اور حق کی دریافت ہے۔ کائنات کے حقائق سے فائدہ نہ اُٹھانے کے بارے میں عبدالرحمٰن بن خلدون (1986، ص 103) لکھتے ہیں:

> ''جب کسی جماعت میں زندگی اور کائنات کے حقائق سے فائدہ اُٹھانے کا ملکہ اور جذبہ باقی نہ رہے تو اُس کا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔''

الغرض اسلام کے نزدیک علم حاصل کرنا معاشرتی ضرورت سے زیادہ انفرادی دینی فریضہ ہے۔ تعلیم دینا اور حاصل کرنا دونوں مسلمان معاشرہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ تعلیم اور تعلّم ایک عبادت ہے جس میں مقصود رضائے الٰہی کا جذبہ ہے۔ عبادت اس وقت مقبول ہوتی ہے جب کہ وہ جاہ ومال اور نام ونمود کے جذبے سے پاک ہو۔ تعلیم کا اسلامی امتیاز مادی اغراض سے بے نیازی ہے۔ حصولِ علم کو ہر طرح سہل بنانا کارِثواب ہے۔ اِس کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنا گناہ کا کام ہے۔ تعلیم دینے سے انکار اسلامی قانون میں موجبِ تعزیر ہے۔ علم دین کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک مسلمان کو عمر بھر مضطرب رکھتی ہے۔

نصابِ تعلیم

اسلامی دین علم و دانش ہے۔ یہ تفکر و تدبّر کی مستقل دعوت اور تحقیق و تجسس کا زندہ نظام ہے، یہ معرفت حقیقی کا سرچشمہ ہے، یہ نور ہدایت کا مصدر و منبع ہے اس نور نے دنیا کے تاریک ترین گوشوں کو منور کر دیا۔ داعیان اسلام کے علمی اکتشافات، تحقیقات، سائنسی اختراعات، ایجادات اور علمی تجربات و ترقیات نے فکر و تدّبر اور علم و عمل کے میدان میں ایسی شاندار روایت قائم کر دی جس کی نظیر آج اس ترقی یافتہ دَور میں بھی کہیں نہیں ملتی۔ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس کے شعبے میں مسلم مفکرین کی یہ روایت ایک قابل قدر ملی میراث ہے۔ آنحضورؐ مسلمانوں کے پہلے معلم تھے اور صفہ مسجد نبوی پہلا باقاعدہ اسلامی دارالعلوم تھا۔ یہاں نصابِ تعلیم کا مرکز و محور قرآن حکیم تھا۔ اس حوالے سے منور ابن صادق (1973، ص 83) لکھتے ہیں:

> ''قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جس کی بدولت عرب، اقالیم یورپ میں شاہانہ کروفر کے ساتھ وارد ہوئے تاکہ ظلمت میں گھری ہوئی انسانیت کے لئے اجالا پھیلائیں، ہیلاس (یونانی) کے علم و حکمت کو مردوں میں سے زندہ کر کے اٹھائیں۔ مشرق کی طرح مغرب کو بھی فلسفہ، طب، فلکیات اور موسیقی کا زریں فن سکھائیں، جدید سائنس کے نومولود کی پرورش کریں۔''

زمانۂ رسالت کے بعد خلفائے راشدین کے عہد میں اس روایت کو قائم رکھا گیا۔ قرآن و حدیث شاملِ نصاب تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شعر و ادب بھی شاملِ نصاب ہو گئے۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم، فہم قرآن و حدیث کے لئے ممد تھی۔

بنی اُمیّہ کے دَورِ خلافت میں بنیادی نصابی خاکہ تو یہی رہا۔لیکن اس میں زبان وادب کی تعلیم کا حصہ مزید وسعت اختیار کرگیا۔عربی زبان چونکہ قرآن وحدیث کی زبان ہے لہذا اس کے متعلقہ علوم یعنی نحو،صرف،لغت اور معنی بھی شامل نصاب ہوگئے۔احادیث کی جانچ پرکھ کا سوال پیدا ہوا تو علم اسماء الرّجال ظہور پذیر ہوکر نصاب کا جزو بن گیا۔اس عہد میں دینی اور دُینوی علوم کا امتزاج زیادہ نمایاں ہوگیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر کے علاوہ تاریخ وفلسفہ، شعر وادب، کتابت وخطابت، نقاشی وخوشنویسی، علم کیمیا اور موسیقی جیسے علوم وفنون بھی شامل نصاب ہوگئے۔

عہد عباسی اسلامی نظامِ تعلیم کے عروج کا زمانہ تھا۔اس دَور میں مختلف علوم شاخ در شاخ تقسیم ہوتے گئے۔دَورِ عباسیہ میں قرآن وحدیث کے علاوہ قرآن وکتابت،خوشخطی،عربی گرامر اور سیرت نبوی کے متعلق تاریخی حقائق نیز علم حساب اور صرف ونحو کی مبادیات کی تعلیم بھی شامل نصاب تھی۔اس دَور میں مروج نصابِ تعلیم میں شامل علوم کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اوّل: وہ علوم جن کا تعلق تفہیم القرآن سے ہے۔ان میں قرأۃ وتفسیر، فقہ، کلام، صرف ونحو، شعر وادب اور لغت وبیان جیسے علوم شامل ہیں۔ان علوم کو علوم نقلیہ کہتے ہیں۔

دوم: وہ علوم جو (مسلمانوں نے) غیر قوموں سے حاصل کئے، انہیں علوم عقلیہ کہتے ہیں۔ان میں فلسفہ، اقلیدس، طب، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، موسیقی اور نجوم شامل ہیں۔اسلامی نظامِ تعلیم کے نصاب کے حوالے سے منور ابن صادق (1973،ص91) مزید لکھتے ہیں:

> ''اسلامی نظامِ تعلیم نے دنیائے علم ودانش میں انقلاب عظیم برپا کردیا۔مختلف علوم وفنون میں بے شمار تصنیفات وتالیفات منظر عام پر آئیں اور نئے نئے علوم ایجاد ہوئے۔''

اس علمی روایت کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو یہ ہے کہ اس تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ہر دور میں ایسے اکابر مفکرین پیدا ہوتے رہے جن میں سے ہر ایک اپنی ذات میں دبستان ہوتا تھا۔ ایسے مفکرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ نصابِ تعلیم چونکہ نظریہ حیات کے تابع ہوتا ہے، اس لئے اسلامی نصابِ تعلیم نے اسلامی نظریہ زندگی کے تمام عناصر کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اسلام کی عالمگیریت نے نصابِ تعلیم کو کائناتی وسعت کا حامل اور ہمہ جہتی بنایا۔ اسلام کی رواداری نے نصابِ تعلیم سے تنگ نظری اور تعصّب کو خارج کیا۔ اسلام کی دور بینی نے نصاب میں مذہب اور سائنس دونوں کو شامل کیا۔ اسلام کی عاقبت اندیشی نے نصاب میں دینی اور اخلاقی مضامین کو شامل کیا۔ غرض اسلام نے نصاب سازی کے لئے جو اصول فراہم کئے اور ان اصولوں کے تحت جن علوم کی تحصیل کی تاکید کی، ان میں روح و مادہ، دین و دنیا، انفرادیت و اجتماعیت، ماضی و حال، حال و مستقبل کا فطری توازن اور اعتدال موجود تھا۔ اسلام نے ایسا نصاب دیا جو تعلیم کو صحیح معنوں میں مسلمان بنادے اور مسلمان کو اس قابل بنادے کہ وہ خود شناسی، خدا شناسی اور کائنات شناسی کے اوصاف سے متصف ہو۔ اسلامی نصابِ تعلیم کی اصل روح اور غایت اولیٰ کو واضح کرتے ہوئے حکیم محمد سعید (1988، ص 95) لکھتے ہیں:

> ''اسلامی نصاب لوگوں کو صرف حرف شناس نہیں بناتا بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ طلبہ ایسے انسان بنیں جنہیں اللہ اور اس کے بندوں کے متعلق اپنے حقوق و فرائض کا علم ہو۔ عرفان حق اور خدمت خلق اس کے بنیادی تصورات ہیں۔ اسلامی نصاب، طلبہ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکامات پر عمل پیرا ہونا سکھاتا ہے اور کتابی علم کو نظری حدود سے نکال کر عملی زندگی میں ان کا استعمال سکھاتا ہے تاکہ انسان

میں علم کی روشنی کے ساتھ ساتھ کردار کی شائستگی، متانت، گہرائی، طمانیت پیدا ہو جو اسلامی تعلیم کی روح ہے۔''

اسلامی نصابِ تعلیم کی نوعیت واضح کرتے ہوئے حکیم محمد سعید (1988، ص92) مزید لکھتے ہیں:

''انسانی تہذیبوں کے اسلامی دَور کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں انسانی تہذیب ایک وحدت کی حامل تھی جس کے گھیرے میں سارے علوم وفنون آتے تھے ___ مذہب اور سائنس دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے گریز نہیں کرتیں بلکہ برابر کی پٹڑیوں پر گامزن ہیں، جو ابدیت کی آخری حدوں پر پہنچ کر مل جاتی ہیں۔''

اسلامی نصاب سے متعلق ایک عام غلط فہمی کا مثبت جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983، ص ص288-287) رقمطراز ہیں:

''نصاب کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ جو مضامین ان مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے یا جو اس وقت پڑھائے جاتے ہیں، ان کا تعلق صرف قرآن وحدیث اور متعلقہ مضامین سے ہے۔ دوسرے مضامین یا تو پڑھائے نہیں جاتے یا اُن کے نفسِ مضمون قطعی دُور از کار ہیں جن میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ کوئی تسلسل۔ یہ بات اتنی صحیح نہیں ہے جتنی آسانی سے کہہ دی جاتی ہے۔ ان تعلیم گاہوں میں علم کی ہر نئ

جہت کا ایک مقام تھا اور تدریس و تحقیق کی نوعیت کے اعتبار
سے اس کا اہتمام ہوتا تھا۔''

پروفیسر سیّد محمد سلیم نے اسلامی نصاب سازی کے درج ذیل اصول بتائے ہیں:

- درسی کتابوں کے انتخاب میں دو باتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اوّل یہ کہ ایسی کتابیں نصاب میں رکھی جائیں جن سے دین کی بنیادی معلومات حاصل ہوں، یعنی فقہ کی گہری اور تفصیلی معلومات حاصل ہو جائیں۔ شریعت اسلامی اس دَور میں ملک کا عام قانون تھا۔ اس لئے حکومت کو قاضیوں اور مفتیوں کی ضرورت رہتی تھی۔

- تدریس کے لئے خاص طور پر کتابیں تیار کی جاتی تھیں۔ اکثر یہ کتب بے حد مختصر اور مغلق ترکیبوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ اختصار اور اغلاق قصداً رکھا جاتا تھا۔ اسی سے مدرسین کے پیشِ نظر کئی فوائد ہوتے تھے۔ مثلاً مفہوم اخذ کرنے میں طلبہ کو محنت کرنا پڑے اور پھر وہ محنت کے عادی ہو جائیں۔ مفہوم متعیّن کرنے میں بحث و مباحثہ کے مواقع میسر آئیں تاکہ طلبہ کا ذہن کھلے، زبان چلے اور اس میں دقّتِ نظر کا ملکہ پیدا ہو۔ ایسی مختصر کتابوں کو ''متن'' کہتے تھے۔ اس کے اغلاق کی وجہ سے اس کی شرح ہونا ضروری تھی۔ اس وجہ سے شرح در شرح کا طویل سلسلہ چلتا تھا۔

- نصاب سازی میں یہ اصول بھی پیشِ نظر رکھا جاتا تھا کہ ہر علم کی ایک منتہیانہ کتاب غور و خوض کے ساتھ طالب علم کو پڑھا دی جائے تاکہ پھر اس علم کی کسی بھی کتاب کا پڑھنا طالب علم کے لئے آسان ہو جائے۔

- آخری دَور میں منطق اور فلسفہ کی تعلیم پر بہت زور تھا۔ اس کو بے حد اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ اس لئے کہ طالب علم کی فکری اور تنقیدی صلاحیتیں بیدار ہوں اور پروان چڑھیں اور وہ غیر

مرعوبانہ انداز میں ہر قسم کے مسائل پر گفتگو کر سکے اور تنقید کر سکے۔

- نصاب کی کتابیں ہمیشہ وہی رہتی تھیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد ان میں تغیّرات لائے جاتے تھے۔

طریق تدریس

تعلیم وتربیت کے اسلامی مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کی ایک فرد کو ضرورت پڑتی ہے، جن سے صحت وتوانائی حاصل ہوتی ہے، جن سے قوائے فکریہ پروان چڑھتے ہیں، جن سے اخلاق سنورتے ہیں، رہائش کے آداب آتے ہیں اور سلیقہ حاصل ہوتا ہے جن سے تکمیل ذات ہوتی ہے اور منصبِ خلافت کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے ان جامع مقاصد کے حصول کے طریقے پروفیسر سیّد محمد سلیم (1980، ص69) لکھتے ہیں:

> ''وعظ ونصیحت کے ذریعے عام مسلمانوں کی تربیت کرنا، کتابوں کا پڑھنا اور پڑھانا، لکھنا اور لکھانا، بُری عادتیں چھڑانا اور اخلاقِ حسنہ پیدا کرنا، سلیقہ اور معاشرتی آداب سکھانا، سرزنش کرنا، مشق اور ریاضت کرانا۔''

تعلیم کو مستقل بالذات شعبہ جات تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کی درسگاہیں بھی جُدا جُدا تھیں اور ان کے استاد بھی جُدا جُدا ہوتے تھے۔ ظاہراً ان میں کوئی ربط ورشتہ نہیں ہوتا تھا کبھی کسی ایک نظامِ تعلیم میں ان اجزاء کو مُنسلک اور مربوط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن معاشرے کا ہر باشعور فرد اِن تربیتی اداروں سے اپنے طور پر کم وبیش ضرور مستفید ہوتا تھا۔ جس کے بعد وہ صحت مند جسم،

متوازن فکر اور پسندیدہ اخلاق کا حامل ہو جاتا تھا۔ ایک صالح فرد بن کر وہ ایک صالح معاشرہ کو فروغ دیتا تھا اور اپنا فریضہء تمدّن ادا کرتا تھا۔ طریقہ تدریس کے بارے میں ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983، ص 325) بیان کرتے ہیں:

> ''قدیم درس گاہوں میں خطبہ (لیکچر) سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کو خاصی اہمیت حاصل رہی۔ لیکن وہ جسے ہم آج دَور جدید کی تحقیق کہتے ہیں اور اس پر سر دُھنتے ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ ان اصولوں اور طریقوں سے واقف تھے بلکہ وہ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔''

ارشاد خداوندی ہے: '' بُلا اپنے رب کی راہ پر' حکمت اور عمدہ طریقے سے' نصیحت ذریعے اور ان سے بحث کر بہترین طریقے سے۔'' اس آیت سے تین طریقہ ہائے تدریس اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ حکمت کا طریقہ، نصیحت کا طریقہ اور بحث کا طریقہ ___ حکمت کا طریق تدریس اسی وقت کامیاب کہلائے گا جب وہ طلبہ کی ذہنی سطح اور ضرورت کے مطابق ہو۔ جس کے نتیجے میں طلبہ کو اطمینان ہو جائے کہ جو بات انہیں سمجھائی گئی ہے وہ ان کے لئے مفید اور با مقصد ہے۔

دوسرا طریقہ تدریس، نصیحت کا طریقہ ہے جو طالب علم کی اخلاقی تربیت کا بہترین وسیلہ ثابت ہوسکتا ہے۔ معلم کا کام صرف الفاظ کے ڈھیر کو شاگرد تک منتقل کرنا نہیں بلکہ اُسے برائیوں سے دُور رکھنا اور نیکی کی راہ پر لگانا بھی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے استاد کو وعظ و نصیحت کرنا ہوگی لیکن نصیحت بے اثر ہوگی اگر استاد کا کردار، وعظ کے الفاظ سے متصادم ہوگا۔ وعظ و تدریس میں تاثر پیدا کرنے کا اہم ترین وسیلہ یہ ہے کہ استاد، اپنے طلبہ کے سامنے عالم با عمل بن کر آئے۔ اس صورت میں اس کے ہونٹوں سے نکلا ہوا، ایک ایک لفظ، طلبہ کے لئے اثر آفرین اور کشش انگیز ہوگا۔ اور اس طرح استاد تعلیم اور تربیت دونوں میدانوں میں فتح یاب ہو جائے گا۔

تیسرا طریقہ تدریس، بحث کا طریقہ ہے یعنی جماعت میں صرف استاد ہی نہ بولتا رہے بلکہ شاگردوں کو بھی تدریس میں شریک کرنے کے لئے حوصلہ افزائی کرے۔ وہ جماعت میں سوال وجواب اور بحث کی فضا پیدا کر کے زندگی سے پرُتدریسی ماحول پیدا کرے۔ اسلامی مدارس میں یہ طریقہ ہر دَور میں پوری افادیت کے ساتھ آزمایا جاتا رہا ہے۔ استاد کا طلبہ سے سوال پوچھنا، طلبہ کا دوسرے طلبہ سے سوال پوچھنا، طلبہ کا استاد سے سوال پوچھنا، کمرہ جماعت میں ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ سارے طلبہ، خود کو تدریس میں شریک سمجھتے ہیں۔ اس طرح سبق میں دلچسپی اور کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور طلبہ میں علم کا ملکہ راسخ ہو جاتا ہے۔

تعلیم کے سلسلے میں مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ مُضر ہے۔ خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچوں کے حق میں۔ کیونکہ یہ استاد کی نا اہلی اور غلط تعلیم کی نشانی ہے۔ ایسے بچے دوسروں کے محتاج ہو جاتے ہیں بلکہ جملہ بداخلاقی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ قہر وتشدّد سے بچوں میں جھوٹ بولنے کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ قہر وتشدّد کے حوالے سے عبدالرحمٰن بن خلدون (1986، ص465) لکھتے ہیں:

''گویا قہر وتشدّد بچوں کو مکر وفریب جھوٹ اور دغابازی کی تعلیم دیتا ہے۔ تشدّد سے جھوٹ اور بدباطنی پیدا ہوتی ہے اور خودداری سلب ہو جاتی ہے''

ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں ایک وحشیانہ خرابی زجر وتوبیخ، تادیب وتشدّد اور طلباء کو متنبّہ کرنے کے لئے جسمانی سزاؤں کا رواج ہے۔ یہ خرابی عام ہے۔ اکثر مکتبوں اور درسگاہوں کے معلم طلباء پر اپنی ہیبت کا سکّہ جمانے کیلئے ایسی سخت اور وحشیانہ جسمانی سزائیں دیتے ہیں کہ دل دہل جاتا ہے۔ ان سزاؤں کے نتیجے میں نادؔم سیتاپوری (1971، ص235) لکھتے ہیں:

''طریقہ تشدّدِ جسمانی کا نتیجہ عام طور سے خراب ہی نکلتا ہے
اور بچوں پر ایسا ڈر اور خوف طاری ہو جاتا ہے کہ وہ پڑھنے
سے جی چُرانے لگتے ہیں اور نئے نئے بہانے تلاش کر کے
درس گاہوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیتے ہیں۔''

نظامِ جائزہ

اسلام کا تصور جائزہ محض تحریری امتحان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ارادے، ایمان اور عمل سعی کے جائزے کو ضروری قرار دیتا ہے وہ نظری علم کی موجودگی کو ہی کامیابی کے لئے کافی نہیں سمجھتا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

''ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تا کہ تمہارے
حالات کی جانچ کریں اور یہ دیکھ لیں کہ تم میں سے مجاہد اور
ثابت قدم کون ہیں۔'' (سورۃ محمد: 31)

ایک دوسری جگہ پر قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے کہ:

''قیامت کے روز ہم ٹھیک ترازو رکھ دیں گے پھر کسی
شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی
کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے
کے لئے ہم کافی ہیں۔'' (سورۃ الانبیاء: 47)

عہدِ نبویؐ میں اخلاق وعادات، بیع وشراء کی نگرانی کا با قاعدہ محکمہ نہ تھا۔ لیکن اس کی بنیاد اسی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ آپ ﷺ بہ نفس نفیس ان امور کی نگرانی فرماتے تھے۔ لوگوں کو جزئیات

اخلاق کی تعلیم دیتے تھے اور اس قسم کی فروگزاشتوں پر مواخذہ فرماتے تھے۔ جائزہ کے متعلق شاہ معین الدین احمد ندوی (1948، ص 91) رقمطراز ہیں:

''فرائض احتساب میں سب سے مقدم فرض عمال کا احتساب ہے، چنانچہ جب عمال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے لاتے تھے تو آپؐ جائزہ لیتے تھے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو اختیار نہیں کیا ہے۔''

خلافت راشدہ کے ادوار میں تمام عمال کو حج کے موقع پر مکہ میں حاضری کا حکم تھا۔ ان کی موجودگی میں اعلان عام کیا جاتا تھا کہ جس شخص کو عمال سے شکایت ہو پیش کرے۔ جو لوگ اپنی شکایت پیش کرتے فوراً تدارک کیا جاتا تھا۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں جائزہ، تدریس و تعلّم کا ایک حصہ تھا طلبہ محض امتحانات پاس کرنے کی خاطر تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اساتذہ امتحان کی نوعیّت کے پیشِ نظر درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ تعلیم مقصود بالذات شے تھی۔ جس کا مقصد فرد کی انفرادیت کی تکمیل تھا۔ کسی درجے کو پاس کرنے کے لئے عرصہ اور عمر کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سادہ طریقِ امتحان کے بارے میں ایس ایم جعفر (1987، ص 25) لکھتے ہیں:

''جو استاد پڑھاتا تھا، وہی جماعت کا امتحان بھی لیتا تھا اور کامیاب طلبہ کو اگلی منزل میں ترقی بھی دیتا تھا۔ اور سرٹیفیکیٹ کے علاوہ اچھے طلبہ کو ان کی قابلیت کے اعتبار سے وظائف، انعامات اور تمغے وغیرہ بھی دیئے جاتے تھے۔ غرض امتحان کا جو طریقہ بھی اس وقت رائج تھا، وہ بہت سیدّھا سادہ، نمائشی کم

اور کارآمد زیادہ تھا۔"

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ علم کی سرپرستی شاہانِ اسلام کا ہندوستان میں ایک قدیم وطیرہ تھا۔ ہندوستان میں ایسے مدارس بھی قائم کئے گئے تھے جن میں طلبہ کے قیام وطعام کا بھی نظم تھا، باضابطہ سرکاری امتحانات بھی ہوتے تھے اور انہی مدارس کے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں بھی دی جاتی تھیں۔ امتحانات کے بارے میں سیّد مناظر احسن گیلانی (س ن، ص 346) مزید لکھتے ہیں:

"غالباً ہندوستان میں بیجاپور ہی کے مدارس ایسے تھے جن میں ہجری سال کے اختتام پر سالانہ امتحان بھی طلبہ کا ہوتا تھا۔ دوسری جگہ تصریح بھی کی ہے، "ہر سال امتحان می شد" امتحان کے تذکرہ میں اس کی تفصیل نہیں بتائی ہے کہ تحریری ہوتا تھا یا تقریری۔"

جائزہ کے حوالے سے پروفیسر رشید امجد اور پروفیسر سیّد فاروق علی (1980، ص 202) لکھتے ہیں:

"صرف تحریری امتحان طالب علم کی قابلیت جانچنے کے لئے ناکافی ہے وہ عملی امتحان کے قائل تھے۔ اسلئے وہ تحریری کے ساتھ زبانی اور عملی امتحان لیتے تھے۔"

استاد چند ایک علماء کے ساتھ طالب علم پر سوال کرتا تھا اور جو موضوعات نصابی کتب میں ہوتے تھے، ان کو ایک ایک کر کے زیرِ بحث لاتا تھا۔ طالب علم کا فرض اوّلین تھا کہ وہ بحث کے دوران اپنے نقطۂ نظر سے حاضرین کو آگاہ کرے اور اعتراضات کا تسلی بخش جواب دے۔ امتحان کے خاتمے پر استاد نصابی کتب کی پشت پر اپنا ایک اجازت نامہ تحریر کرتا تھا، جس میں اس بات کی سند ہوتی تھی کہ طالب علم نے اس کتاب کو مکمل اور تفصیلاً پڑھا ہے آخر میں استاد اور اس کے علماء ساتھی اپنی

اپنی مہریں ثبت کرتے تھے۔ سند دینے کے بارے میں ڈاکٹر احمد شلبی (1963، ص 63) لکھتے ہیں:

> ''یہ سند اسی نصاب کے متعلق ہوتی تھی جو استاد کی نگرانی میں
> پایۂ تکمیل کو پہنچتا تھا۔ شاگرد جس کتاب کی تکمیل کر لیتا تھا، اس
> کے ابتدائی سادہ ورق پر سند لکھ دی جاتی تھی۔''

اس دار العمل میں جسے دنیا کہتے ہیں انسان جس قدر کوشش کرتا ہے اتنا ہی صلہ اسے ملتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر قدم پر اپنا احتساب کرتا اور یہ جائزہ لیتا ہے کہ وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ اگر اسے کوئی کوتاہی یا خامی نظر آئے تو اسے دور کرنے کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہو اس کا طرزِ عمل ایسا ہی ہوتا ہے۔ استاد اور طالب علم بھی ہمہ وقت اپنی کاوشوں کو جانچتے رہتے ہیں تاکہ ان کا تعلیمی پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہو۔

معلم اور متعلّم کے تعلقات

معلم

ہر طالب علم کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ صرف کتابوں ہی سے اپنے علم میں اضافہ نہ کرے بلکہ کسی استاد کی خدمت میں رہ کر براہ راست درس لے۔ بعض مسلمان تو اس بات کو بدبختی تصور کرتے تھے کہ استاد کو چھوڑ کر محض کتاب پر اکتفا کیا جائے، اور بعض حضرات تو یہاں تک کہتے تھے کہ بے استاد طالب علم بے دین ہے جس نے شیطان کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ حصولِ علم کے لئے استاد کی ضرورت ہے تو پھر ان ہی حضرات کا انتخاب کیا جائے جن کا علم وسیع ہو اور جن کا اپنے زمانے کے کاملین سے پورا پورا ربط وضبط ہو۔ استاد کی

ضرورت اور اہمیت کو مولانا شبلی نعمانی (1961، ص 95) بیان کرتے ہیں:

''معلم کا منصب شانِ نبوت بلکہ شانِ خداوندی کا حامل ہے ہر نبی قوم کے لئے معلم ہی بن کر آتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کا معلم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم خود خدا نے دی تھی لہذا معلم کا منصب نہایت مقدس اور مقتدر ہے اس کی افادیت کا یہ حال ہے کہ خود رحمت للعالمین آدمی کو زندگی بھر یا متعلّم دیکھنا چاہتے تھے یا معلم تیسری صورت آپؐ کو پسند نہ تھی۔''

ہر شخص کی قوت سے باہر ہے کہ وہ صرف اپنی کوشش سے علم حاصل کرے اس لئے ہر طالب علم کے لئے ایک استاد کی ضرورت ہے جو حصول علم، تعمیر و سیرت اور اُس کے عقائد و اعمال میں رہنما کا کام کرے استاد کی ضرورت اور اہمیت کو ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983، ص 302) بیان کرتے ہیں:

''اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک منزل اس کے آگے اور بھی آتی ہے اور وہ ایک ایسی منزل ہے جس کے اندر کوئی قرار نہیں، وہ منزل ایک ایسے فعال اور متحرک انسان کی ہے، جو بعض قواعد و ضوابط کے تحت متعلّم کی ذہنی صلاحیت کے مطابق اس کی پرداخت کرتا ہے۔''

تعلیم کسی صاحبِ فکر و نظر اور صاحبِ علم و عمل معلم کی تربیت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اساتذہ کی ضرورت کے حوالے سے ناؔدم سیتاپوری (1971، ص 199) لکھتے ہیں

"کسی کتاب کو رٹ لینا یا صرف حفظ کر لینا ہی تعلیم نہیں
کہلاتا۔ضروری ہے کہ ہر علم یا فن کو ایسے اساتذہ سے حاصل
کیا جائے جو اُس کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہوں۔علمی
مسائل میں اختلاف رائے مسائل علمیہ میں بہت سے ایسے
گوشے پیدا کر دیتا ہے جس سے منصف مزاج اپنے لئے
راہیں تلاش کرسکتا ہے۔"

آجکل مشین، ٹیپ اور ریڈیو کی مدد سے تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن ابھی تک ابلاغ عامہ کا کوئی ذریعہ معلم کا بدل ثابت نہیں ہوسکا۔معلم جب طالب علم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتا ہے تو وہ بات اس کے ذہن میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

متعلّم

مسلمان طالب علم انتہا درجے کا مستعد اور سرگرم رہا ہے۔اس نے حصولِ علم میں بڑی سختیاں برداشت کیں اور کانٹوں بھرے راستے سے گزرا۔کوئی دِقّت، کوئی پریشانی اسے اپنے مقصد کے حصول سے نہ روک سکتی تھی۔ہمارے خیال میں یہ سب ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور اقوال بزرگانِ دین کا اثر تھا جن سے تلاش علم کے لئے ہمت افزائی ہوتی تھی اور جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ایک صاحبِ علم کا درجہ کتنا ارفع واعلیٰ ہے۔

مسلمان مفکرین نے طلبہ اوران کی نفسیات کے بارے میں اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ ابن خلدون، بوعلی سینا، غزالی، قاضی ابن جماعہ، النعیمی، زرنوجی، ابن جبیر، الجاحظ، یاقوت وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ان میں سے ہر مفکر نے اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق طلبہ کی ضروریات اور ان کی حیثیت پر قلم اٹھایا۔طالب علم کے بارے میں جو

بات ذہن میں آتی ہے، وہ اس کے فکر ونظر اور شخصیت کی تربیت ہے۔ڈاکٹر ایم اے عزیز (1983،ص ص 317-318) لکھتے ہیں:

''اپنی توجہ صرف طلبہ کی فضیلت علمی پر مرکوز کرنا کافی نہیں بلکہ
ان کی سیرت اور کردار پر بھی توجہ دینا اتنا ہی ضروری ہے اور
ان کی کسی بے جا حرکت پر نرمی سے سرزنش کرنا بھی۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ درس گاہوں میں معلمین پر تین فرض عائد ہوتے ہیں۔اوّل: یہ کہ طلبا کو اس طرح پڑھائیں کہ فضیلت علمی کا تاج ان کے سر پر رکھا جا سکے۔ دوم: یہ کہ ان کے اخلاق وکردار کی تربیت کی جائے اور سوم: بوقت ضرورت نرمی سے سرزنش کی جائے۔اس حوالے سے عبدالرحمٰن بن خلدون (1986،ص 466) لکھتے ہیں:

''اگر آداب سکھانے کے لئے بچوں کو مارنے کے بغیر چارہ ہی
نہ ہو تو تین قمچیوں سے زیادہ نہ ماری جائیں۔''

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمان اساتذہ نے ہمیشہ طلبہ سے اپنا ذہنی اور قلبی تعلق قائم کیا اور انہوں نے طلبہ کی فضیلت علمی اور سیرت سازی دونوں پہلوؤں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا۔مسلمان اساتذہ کا کردار مثالی تھا۔ان کے ایثار، خلوص اور تعلیمی لگن کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔دوسری طرف مسلمان طلبہ اپنے اساتذہ سے بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور وہ بلاشبہ سعادت مندی، جفاکشی اور علمی دوستی کے مظہر تھے۔اسلامی نظامِ تعلیم میں استاد اور شاگرد کے تعلق سے پیدا ہونے والے مثبت ثمرات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد (1982،ص 444) لکھتے ہیں:

''اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد میں قلبی تعلق ہی نہ تھا

بلکہ استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے
تھے اور انہیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبا کا معیارِ
علم ہی بلند نہ ہو بلکہ ان کا معیارِ اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے
انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں۔ اگر اس معاشرے میں
تقویٰ، ایفائے عہد، عفت و عصمت، ایثار و قربانی، صِلہ رحمی،
اخلاق و مروّت اور ہمدردی و اخوت کا دَور دورہ تھا تو اس کی
وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرتی
تھی۔''

اسلام نے تدریس کو مؤثر بنانے اور تعلم کو ٹھوس، مستقل اور دیر پا بنانے کے لئے استاد اور شاگرد کے تعلقات کو بے حد اہمیت دی ہے۔ پروفیسر سیّد محمد سلیم (1980، ص 38) لکھتے ہیں:

''اسلام نے تعلیم و تعلّم، امور درس و تدریس کے لئے مومنین
کے قلوب کو آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد تعلیم کے دونوں فریق
رضائے الٰہی کی خاطر عملِ تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس
طرح تعلیم کا ایک خود کار نظام برپا کر دیا جو صدیوں خوش
اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔''

استاد اور شاگرد کے درمیان ذاتی تعلق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے پروفیسر حمید احمد خان (1975، ص 241) لکھتے ہیں:

''استاد کے لئے لازم ہے کہ اپنے شاگردوں میں سے ہر ایک
فرد بشر کو بطور ایک فرد بشر کے بطور پہچانے اور یہ پہچان بجز صحیح

ہمدردی کے حاصل نہیں ہوتی۔ دلی شفقت اور موانست کے
بغیر استاد اور شاگرد کا رشتہ، خود اس میں کتنی ہی مقدار علم داخل
کی جائے، کھوکھلا اور مصنوعی رہتا ہے۔ تعلیم کی بنیاد لفظوں کے
ڈھیر پر نہیں، ایک ذاتی تعلق پہ قائم ہوتی ہے۔''

اسلامی نظامِ تعلیم میں استاد اور شاگرد کے تعلق کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے
خرم جاہ مراد (1981، ص 41) لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی کہ اس
میں استاد اور شاگرد کے درمیان ذاتی تعلق رہا۔ استاد شاگرد
کی ذات سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور بڑی بڑی کلاسوں کے
باوجود استاد صرف لیکچر دے کر نہ چلا جاتا تھا بلکہ اس انسانی
مواد میں پوری دلچسپی لیتا تھا جس کی حیثیت اس کے لئے ایک
امانت تھی۔''

استاد اور شاگرد کے بے لوث اور اخلاص پر مبنی رشتے کے بارے میں ایس ایم جعفر
(1987، ص 12) لکھتے ہیں:

''استاد اور شاگردوں کے درمیان بڑے محبت آمیز تعلقات
ہوتے تھے۔ وہ اکثر ایک ساتھ مل کر رہتے جس سے ان کے
درمیان ایک مستقل ذہنی رشتہ قائم ہو جاتا۔ ان کا تعلق آپس
میں باپ بیٹے کا ہوتا تھا۔ اس کا بڑا ثبوت یہ تھا کہ طلباء سے نہ
صرف کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ اکثر استادوں کی طرف

سے ان کے لئے مفت طعام وقیام کا انتظام بھی ہوتا۔''

جس طرح تدریس کے کئے آداب کی ضرورت ہے اسی طرح تعلیم کے لئے بھی بعض آداب ضروری ہیں۔ طالب علم کا مقصود ہدایت کا حصول ہے۔ متعلّم کے لئے درج ذیل آداب امام غزالی (س ن، ص 65) ضروری قرار دیتے ہیں۔

''اپنے نفس کو رذیل عادات اور بُری صفات سے پاک کرے، طالب علم دنیا کے شغل کے علاقے کم کر دے، علم پر تکبر نہ کرے، ساتھی طلباء کے ساتھ پیار محبت سے پیش آئے، پسندیدہ علوم میں حتی الامکان دسترس حاصل کرے، ہر فن کی تحصیل میں ترتیب وتدریج کا لحاظ رکھے، اختلافی مسائل کے متعلق غیر ضروری معلومات سے پرہیز کرے، اپنی اصلاح اور آخرت میں اللہ کی رضا کو علم کا مقصد سمجھے۔''

معلم کا منصب پیغمبرانہ منصب ہے۔ اُس کی ذمہ داری بڑی عظیم ہے۔ پیغمبر اپنے کام پر کبھی اجر کے طالب نہیں ہوئے۔ صاحب مال معلمین کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ مشاہرہ نہ لیں۔ معلم کے لئے حسب ذیل آداب واوصاف امام غزالی (س ن، ص 74) بیان کرتے ہیں۔

''شاگردوں کی خیر خواہی اور رہنمائی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے، اپنی اولاد کی طرح سمجھے، برائیوں سے روکنے کے لئے پیار ومحبت کا طریقہ اختیار کرے، طلباء کے سامنے اپنے مضمون کے مقابلے میں دوسرے مضامین کی بُرائی نہ کرے، اپنے علم کے مطابق عدل کرے، موثر تدریسی عمل کے لئے ضروری ہے

کہ معلم سبق اچھی طرح تیار کر کے آئے۔"

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم عبادت ہے اور استاد شاگرد دونوں عبادت میں مصروف ہیں۔ دونوں مجاہد ہیں اوران کا جہاد سیفی جہاد سے برتر حیثیت رکھتا ہے۔اس طرح درس وتدریس کا کام کاروباری اور پیشہ ورانہ سطح سے بلند ہوکر اخلاقی اور روحانی وقعت کا حامل ہوجاتا ہے۔ باہمی تعلقات کے ضمن میں استاد شاگرد کی پوزیشن کی وضاحت ضروری ہے۔تعلیمی عمل میں شاگرد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بچے تو جنت کے پھول ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عملِ تعلیم و تعلّم میں مرکزی کردار طالب علم کا ہے اور استاد معاون ودستگیر ہے۔استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کے چند اصول یہ ہیں:

- استاد شاگرد کے درمیان پہلا منطقی رشتہ علم کا ہے۔استاد علم دیتا ہے اور شاگرد حاصل کرتا ہے اور دونوں اپنے طور پر بھی علم حاصل کرتے رہتے ہیں۔ استاد کو بہر حال اپنا علمی فریضہ خوش اسلوبی سے سرانجام دینا چاہیے۔

- طلبہ کی تحسین اور حوصلہ افزائی کے بارے میں اسلامی روایات نہایت تابناک ہیں۔ معلم اور متعلّم کا دوسرا رشتہ اخلاق کی تربیت کا ہے۔علم ودانش کے ساتھ ساتھ تربیت اخلاق ضروری ہے۔اسکے لئے معلم کو چاہیے کہ وہ خود بھی اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہو۔

- تیسرا رشتہ ادب وتادیب کا ہے۔معلم مؤدب ہے ادب و تعظیم وتکریم انسانیت اسلام کی جان ہے۔معلم کا فرض ہے کہ طلبہ کو گفتگو، نشست وبرخاست اور طعام کے آداب سکھائے۔ مناسب انداز میں تادیب وسرزنش بھی کرے مگر متعلّم کی تضحیک سے اجتناب کرے۔

- استاد اور متعلّم کا تعلق طبیب اور مشیر کا سا ہے۔استاد روحانی طبیب اور مشیر بھی ہے۔طلباء کے روحانی، اخلاقی، معاشرتی مسائل کو حل کرنا معلم کا فرض ہے۔معلم طلبہ کے اقتصادی مسائل

تک حل کرتے تھے۔

- استاد اور شاگرد علمی اور فنی منصوبوں میں برابر کے شریک ہیں استاد کا یہ رشتہ طالب علم کے لئے رہبر کا ہے۔ معلم طلبہ کو جادۂ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دیتا ہے۔

مسجد کا کردار

مسجد کی بناء اس طرح پڑی کہ قدیم زمانے سے عربوں میں ایک عبادت گاہ ہوتی تھی اور اسے اللہ کا گھر تصور کیا جاتا تھا جہاں لوگ زیارت کے لئے آیا کرتے تھے اور مناسک عبادت ادا کیا کرتے تھے۔ بیت الحرام تمام عربوں کے لئے مقدّس مقام تھا خواہ وہ کافر ہوں یا موحد۔ نزولِ اسلام کے بعد مسلمانوں نے بیت الحرام کی حیثیت کو قائم رکھا اور جب کبھی ممکن ہوا انہوں نے وہاں عبادت کی۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسجد اسلامی معاشرے کا مستقل اور مرکزی ادارے کے طور پر ہر اسلامی دَور میں اہم رہی ہے۔ مسجد صرف ایک عبادت خانہ نہیں بلکہ دربار، عدالت، مقام مشاورت، مکتب، اقامت گاہ، کتب خانہ، مطب، فنونِ لطیفہ کی نمائش گاہ اور اعلانات کے مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ اخلاق ساز ادارہ دینی اور دُنیاوی تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اسلام نے حصولِ علم کو زندگی کی اساس قرار دیا۔ مسلمان کے لئے اسے فرضِ عین قرار دیا۔ دین مصطفیؐ نے علم کو جتنی عزت اور فضیلت دی ہے، دنیا کے کسی اور مذہب یا نظام فکر نے نہیں دی۔ مسجد دین و علم یعنی اسلام کا قدیم ترین تعلیمی ادارہ ہے یہ ادارہ تعلیمی اعتبار سے آج بھی اتنا ہی زیادہ مؤثر اور مفید ہے جتنا چودہ صدیاں پیشتر تھا۔ رسول اکرمؐ نے مکہ سے ہجرت کی تو بیت الحرام کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''خدا کی قسم! دنیا میں میرے لئے تو سب سے زیادہ مرغوب جگہ ہے اور خدا کے نزدیک تو دنیا کا سب سے زیادہ محبوب مقام ہے۔ اگر مجھے مجبور نہ کیا جاتا تو میں ہرگز تجھے چھوڑ کر نہ

جاتا۔''

رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ جاتے ہوئے مدینہ سے باہر مسجد قبا کی بنیاد ڈالی جو اسلام میں سب سے پہلی مسجد ہے۔آپؐ جب مدینہ پہنچے تو آپؐ نے المربد میں مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی۔اور اس مسجد میں مسلمانوں میں دینی و دنیاوی تعلیم دینی شروع کی۔تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بالکل ابتدائی اَدوار میں مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو اور مساجد تھیں جہاں تعلیم و تدریس کا مقدس فریضہ سرانجام دیا جاتا تھا۔مہر گل محمد (1988،ص66) لکھتے ہیں:

''مسجد بنی زریق، مسجد بنی غفار، مسجد اسلم، مسجد جہنیہ، مسجد بنی عمرو، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلم، مسجد بنی رائح۔''

اس زمانے میں مسجد کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ مساجد اس زمانے میں سیاست کے مراکز تھیں، انصاف کی عدالتیں تھیں، تعلیمی درسگاہیں تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عبادت گاہیں تھیں۔لہذا جہاں کہیں اسلام پھیلتا جاتا تھا مسجد کی بناء لازمی تھی۔

تقدس اور معرفت کی خاص فضا کی حامل مسجد کی اہمیت قرآن وحدیث سے واضح ہے۔

قرآن حکیم کے مطابق:

- مسجدیں اللہ ہی کی ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت مت کرو۔

(سورۃ الجنّ)

- اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

(سورۃ التوبہ)

- اے آدم کے بیٹو! ہر حاضری کے وقت اپنا لباس زینت پہن لیا کرو۔

(سورۃ الاعراف)

- اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں ذکر اللہ کو بند کرا دے اور اس کی ویرانی کی کوشش کرے؟ ان لوگوں کو تو کبھی بھی بے باک ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیے۔ ان کی دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی ان کی سزا سخت ترین ہوگی۔ (سورۃ البقرۃ)

حضور اکرمؐ مسجد کی خدمت، عظمت اور اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

- قیامت کے دن مسجدوں کے سوا ساری زمین فنا ہو جائے گی۔
- جو اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں اسی طرح کا گھر بنائے گا۔
- جو شخص مسجد سے اُلفت رکھے، اللہ تعالیٰ اس سے اُلفت رکھتا ہے۔
- جو شخص مسجد میں بیٹھے، وہ اپنے رب کے ساتھ ہم نشینی کرتا ہے۔ تو اس کے حق میں نہایت مناسب ہے کہ وہ بجز خیر کے اور کچھ نہ کہے۔
- جب لوگ اللہ کے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی کتاب کی تلاوت کریں اور درس و تدریس میں مشغول ہوں تو ان پر قلبی سکون نازل ہوتا ہے۔ رحمت ان پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ فرشتے ان کو گھیرے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کی مجلس میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ مسجد کے بارے میں منور جہاں رشید (1985، ص 76) لکھتی ہیں:

> ''مسجد میں عبادت تو لازمی طور پر ہوتی ہے دینی اور اخلاقی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ اور بعد کے اَدوار میں دنیاوی تعلیم بھی لازمی طور پر دی جاتی تھی۔ یہ مسجد کی علمی خدمات ہی کی برکت

تھی کہ اسلامی معاشرے میں تقریباً ہر فرد اور ہر پیشہ ور خواندہ تھا۔''

مساجد کی تعداد میں تیزی کے بارے میں، ڈاکٹر احمد شلبی (1963، ص ص 48-47) لکھتے ہیں:

''جہاں کہیں اسلام پھیلتا جاتا تھا، مسجد کی بنا لازمی تھی اور ہر مفتوحہ مقام پر اور ہر نئے شہر میں مسجد بھی جلد از جلد تعمیر کر دی جاتی تھی ...... چنانچہ مساجد کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ گئی یہاں تک کہ یعقوبی کا دعویٰ ہے کہ اس نے تیرویں صدی ہجری میں صرف بغداد میں تیس ہزار مساجد کا شمار کیا......ابن جبیر (متوفی 614ھ) کا قول ہے کہ صرف سکندریہ میں بارہ ہزار مساجد تھیں۔''

تعمیر مسجد اور کردار مسجد پر روشنی ڈالتے ہوئے، پروفیسر بختیار حسین صدیقی (1983، ص40) لکھتے ہیں:

''مسجد اسلام کا روایتی تعلیمی ادارہ ہے جس کی ابتدا مسجد نبوی سے ملحق، اصحاب صفہ کی درس گاہ سے ہوئی۔ جو باہر سے آنے والے طلبہ کے لئے دارالاقامہ کا کام دیتی تھی اور مدرسے کا بھی۔ پہلی صدی ہجری میں جہاں جہاں بھی اسلام کے قدم جمے مسجد، تعلیم کا مرکز رہی۔''

چونکہ اسلام کے اوّلین دَور میں نصاب میں صرف اسلامی دینیات شامل تھی اور طلبہ کی

تعداد بھی کم تھی، اس لئے مساجد کو تعلیمی وتدریسی امور کے لئے با قاعدہ استعمال کیا جاتا رہا۔لیکن اسلامی فتوحات کے بعد جب طلبہ اور تعلیمی حلقوں میں اضافہ ہوا نیز بہت سے نئے مضامین نصاب میں داخل ہو گئے تو قدرتی طور پر مسجد کا تعلیمی پروگرام ضروری یا کلی طور پر مدارس کو منتقل ہوا۔اس تبدیلی کا ذکر ڈاکٹر احمد شلبی (1963، ص 52) اس طرح کرتے ہیں:

''علم کی ترقی وتوسیع کے باعث ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی جس کے لئے مجرد علمی فضیلت کی خاطر زندگی بسر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔علم کی مزید توسیع کی غرض سے اور ایسے حضرات کے لئے وظائف کا انتظام کرنے کی غرض سے مدرسے قائم کئے گئے تھے۔''

یہ تبدیلی نام کی تھی ۔مسجد سے کامل الحاق کی وجہ سے اسلامی مدارس میں بھی مسجد کی فضا قائم تھی ۔ یہاں بھی علم اور عبادت ساتھ ساتھ چلتے تھے اور آج تک یہ سلسلہ درس وتدریس، مسجد کی وساطت سے عالم اسلام میں کامیابی سے جاری ہے۔جامعہ ازہر کے متعلق ڈاکٹر احمد شلبی (1963، ص ص 136-135) لکھتے ہیں۔

''یہاں آج بھی بے شمار طلباء اسلامی دنیا کے اطراف سے آ کر جمع ہوتے ہیں ۔گھانا سے لے کر ملایا کی ریاستوں تک سے طلباء آتے ہیں اور ہر ملک کے طلباء کے لئے مخصوص رواق ہیں جامعہ ازہر میں یہ سب طلباء نصابِ تعلیم سے مختلف شعبوں میں فاضل شیوخ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں ۔طلباء کے لئے یہ رعایت ہے کہ کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ ان کے طعام وقیام کا

انتظام بھی اوقاف سے ہوتا ہے۔ مفت تعلیم کی یہ نہایت قابل قدر مثال ہے۔ جس سے غریب سے غریب مستفیض ہوتے ہیں خواہ کسی قوم سے ان کا تعلق ہو، کوئی زبان اور کسی طبقے سے تعلق ہو۔''

وجودِ مطلق صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی ہر شے اپنے وجود کے لئے اِس کی محتاج ہے، اس عقیدے کے تحت تعلیم کا منتہائے مقصود اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو روحانی نصب العین پر مرکوز ہو۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے کسی فرد کو تیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق اور اس کی اپنی ذات کے حقوق پوری طرح ادا کرنے کے قابل بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادت کے لئے پیدا کیا، جس کے مفہوم میں ان تینوں انواع کے حقوق کی ادائیگی شامل ہے، انسان اپنی ذات کے حقوق ادا کرے تو خدا خوش ہوتا ہے۔ وہ بندوں کی خدمت کرے تو خدا خوش ہوتا ہے لیکن اپنی ذات اور دوسروں کی پوری پوری خدمت وہی شخص کرسکتا ہے جو خدا کی خوشنودی کا خواہاں ہو۔

پس تعلیم کی غایت نہ صرف اچھے افراد پیدا کرنا ہے اور نہ صرف اچھے شہری بلکہ بیک وقت اِن دونوں غایات کو پورا کرنا ہے۔ انفرادی حیثیت سے اِس کا ہدف انسان میں تقویٰ کا وصف پیدا کرنا ہے۔ جس میں ایک طرف عفو ورحم کی سیرت پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ یاس، حزن اور خوف کی بیماریوں سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

باب سوم

برصغیر میں برطانوی نظامِ تعلیم کے معیّنات

دنیا میں جو بھی نظامِ تعلیم قائم کیا جاتا ہے اس میں اوّلین بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی تیار کرنا چاہتے ہیں اور آدمیت کا وہ کیا نقشہ آپ کے سامنے ہے جس کے مطابق آپ لوگوں کو تعلیم اور تربیت دینا چاہتے ہیں۔ انگریز نے جو نظامِ تعلیم برصغیر میں قائم کیا تھا اس کا بنیادی مقصد ایسے افراد تیار کرنا تھا جو حکومت کرنے میں ان کی مدد کرسکیں۔ انہیں ایسے آدمی درکار تھے جو ان کی زبان سمجھتے ہوں۔ جو ان کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوسکیں۔ چنانچہ اس نظامِ تعلیم میں انہی مقاصد کی جھلک نظر آتی ہے جو انگریزوں کے پیشِ نظر تھے۔

تعلیمی مقاصد

انگریزوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد لارڈ میکالے کے حوالے سے منظور احمد جاوید (1979، ص63) لکھتے ہیں:

> ''ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے، جس پر ہم اس وقت حکمران ہیں ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق، فہم وفراست کے نقطہ نظر سے انگریز ہو۔''

لارڈ میکالے، بینٹنک اور انگریزی کے دوسرے حامیوں کا اصل مقصد انگریزی تعلیم سے جو تھا۔اس حوالے سے شبیر احمد (1974، ص372) لکھتے ہیں:

''کوئی ہندو جسے انگریزی تعلیم دی گئی ہو۔کبھی خلوص سے اپنے مذہب پر قائم نہیں رہ سکتا...... یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر تعلیم کی ہماری تجویزوں پر عمل کیا گیا تو آج سے تیس 30 سال کے بعد بنگال کے اچھے طبقوں میں ایک بھی بت پرست باقی نہیں رہے گا۔ان کی مذہبی آزادی میں معمولی سی دخل اندازی کے بغیر محض علم وفکر کے نتیجے میں۔''

انگریز تعلیمی نظام کو اس طرح استوار کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کی اخلاقی وذہنی نشوونما کے ذریعے یہ جذبات بھی پیدا کیے جائیں کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہوں اور تعلیم ہی کے ذریعے ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ کمپنی کی ملازمت حاصل کرسکیں۔اس حوالے سے ظفر حسین خان (1975، ص ص 142-141) لکھتے ہیں:

''اگر ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت، کمپنی کوشش کرے گی تو نہ صرف اس کو انگلستان میں نیک نامی ہوگی۔ بلکہ اس سے دیگر فوائد بھی حاصل ہوں گے ۔ مثلاً ہندوستان سے خام مال حاصل کر کے اور ہندوستان کے وسائل سے فائدہ اٹھا کر دیگر ممالک سے تجارت ہو سکے گی ۔ جس میں ایک طرف ہندوستان میں پیداوار میں اضافہ ہوگا ۔ یہاں کے عوام کو روزگار بھی ملے گا۔ جو لوگ کمپنی سے فائدہ حاصل کریں گے وہ اس کے بہی خواہ اور وفادار بھی ہوں گے۔''

کمپنی نے جو تعلیمی پالیسی بنائی تھی۔ جس سے انگریزوں کے تعلیمی مقاصد عیاں ہوتے ہیں اس کے بارے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (1975، ص 53) رقمطراز ہیں:

> ''کمپنی کی حکومت کا واضح مقصد انگریزی زبان اور مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا ہے تاکہ یہاں کے لوگ مغربی تہذیب اور مغربی مذہب کو قبول کرلیں۔ دوسرے درجے میں انگریزی زبان جاننے والے ایسے منشیوں اور کلرکوں کی فوج تیار کرنا ہے جو حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کا کام دے سکیں۔ جب تک ایسے کلرکوں کی ایک معقول تعداد تیار نہیں ہو جاتی، اس وقت تک مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو بوجہ مجبوری گوارا کرنا، تاکہ کاروبار حکومت میں خلل واقع نہ ہو۔ اسلامی نظامِ تعلیم کو بہر حال ختم کرنا۔ فارسی زبان کی بالادستی اور ہمہ گیریت کو ختم کرنا۔ رابطہ عوام کے لئے مقامی زبانوں کو فروغ دینا۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانا ہے۔''

لارڈ میکالے کی تجویز 1835ء کو بطور قرارداد منظور کرتے ہوئے لارڈ ولیم بینٹنک نے برطانوی ہند میں تعلیم کے جو خطوط متعین کئے تھے اس کے حوالے سے اے۔آر۔مُلِک (1954، ص 231) لکھتے ہیں:

> ''سرکاری تعلیم کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم وفنون اور سائنس کی اشاعت کرنا، علوم وفنون کی تدریسی زبان انگریزی ہوگی۔''

لارڈ میکالے کی تجویز میں مزید طے پا گیا کہ آئندہ سے ملک کی سرکاری زبان انگریزی ہوگی نیز مشرقی علوم کی اشاعت پر آئندہ کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا جائے گا اور طلبہ کو وظیفہ دینے کا قدیم طریقہ ختم کر دیا جائے گا۔

انگریزی زبان کی ترویج

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین ہندوستان میں ایک ہی مقصد لیکر آئے تھے اور وہ یہ کہ گنگا و برہم پتر کی وادیوں سے سیم وزر سمیٹ کر ٹیمز کے دہانے تک پہنچا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمپنی کے ابتدائی دَور کے اعلیٰ و ادنیٰ حُکام ہندوستانیوں کی تعلیم کے مسئلہ کو ایک فضول اور احمقانہ فعل سمجھتے تھے۔ اس رویّے کے بارے میں سیّد مصطفیٰ علی بریلوی (1971، ص 64) لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں تعلیم ہی ایک ایسا شعبہ ہے جس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے گورنروں اور وائسرائے کو بہت سہولت حاصل رہی ہے۔ اس کے تجربہ کار سیکریٹری اپنے صبح کے اوقات جب وہ تازہ دم ہوتے ہیں مالی اور عدالتی امور انجام دیتے ہیں لیکن جب سورج ڈھلنے لگتا ہے اس وقت تعلیمی ریزولیوشن تیار کرتے ہیں۔ جس میں ماہرین تعلیم کو یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ ان کا کام کریکٹر کی تعمیر اور اعلیٰ اقدار کے مالک شہری پیدا کرنا ہے لیکن ان پر یہ پابندی ہے کہ وہ رائے عامہ اور اقتصادیات کے مقررہ حدود کے تابع رہتے ہوئے اثر انداز ہوں۔''

تعلیم کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے متوجہ نہ ہونے کی وجہ جسٹس سیّد محمود کے حوالے سے

سیّد طفیل احمد منگلوری (1971، ص163) بیان کرتے ہیں:

''تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں اس لئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام نہ سمجھتے تھے۔''

انگریز تعلیمی معاملات میں حکومت کی مداخلت کے عادی نہیں تھے۔ اسلئے من وعن اس فلسفہ پر یہاں بھی عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اور یہ تصور کرلیا گیا کہ ریاست میں تعلیم بغیر سرکاری مداخلت کے خود بخود پھیل جائے گی۔ لہذا اس ناقص پالیسی پر بڑی بیدردی کے ساتھ تقریباً بیس سال تک عمل ہوتا رہا۔ وارن ہسٹینگز نے کچھ سرکاری ضرورتوں نیز سیاسی دوراندیشی کے تحت اپنے طور پر سرکاری پالیسی میں صرف برائے نام تبدیلی کی۔ اس نے 1781ء میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی نیز ایک ادارہ ہندوؤں کی تعلیم کے واسطے بھی قائم کیا۔ ان اداروں کا حقیقی مقصد علوم اسلامی یا ہندوؤں کے علوم کی ترویج واشاعت نہیں تھا جس کے متعلق سیّد مصطفیٰ علی بریلوی (1971، ص ص 68-67) لکھتے ہیں:

''فضول مقدمات میں انگریز ججوں کو مدد دینے کے لئے لوگوں کو محض مولوی اور پنڈت ہی بنانا تھا۔ عام لوگوں میں ....اشاعت تعلیم نہ کرنے کا خیال مزید بیس سال تک قائم رہا۔''

ہندوستان میں تعلیم دینے کی تجویز کے متعلق مسٹر چارلس گرانٹ کے حوالے سے سیّد مصطفیٰ علی بریلوی (1971، ص72) لکھتے ہیں:

''تعلیم یافتہ اشخاص کے واسطے ایک غیر زبان کا سیکھنا چنداں مشکل کام نہیں ہے اور اس لئے انگریز معلم ہندوستان کی زبانوں میں تعلیم دینے کے واسطے جلد تیار ہو سکتے ہیں ۔ بہ نسبت اسکے ہندوستانی ہماری زبان میں تعلیم پانے کے واسطے تیار ہوں۔''

تجویز میں مزید کہا گیا کہ گورنمنٹ کے لئے نہایت ضروری بات ہے کہ ایک معقول خرچ سے صوبہ جات کے مختلف حصوں میں ایسی درس گاہیں قائم کرے جن میں انگریزی پڑھنے لکھنے کی مفت تعلیم دی جائے۔ جو چیز ہم کو اوّل سکھانی چاہیئے اور جو باقی اور چیزوں کے سکھانے کا ذریعہ ہوگی ضروری طور سے انگریزی زبان ہے یہی وہ کنجی ہے جو ان پر دنیا بھر کے نئے خیالات کے دروازے کھول دے گی اور صرف مصلحت ملکی نے ہم کو اس وقت تک ان کے ہاتھ میں یہ کنجی دینے سے روکا تھا۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ کمپنی نے اپنی تعلیمی ذمہ داری کو محسوس کیا مشن اسکول کے حمایت کرنے والوں نے بڑا زور لگایا اور کہا کہ ان کو انگریزی سکول قائم کرنے اور تبلیغ کرنے کی اجازت دی جائے آخر کار پارلیمنٹ نے یہ تجویز منظور کر لی جو تعلیمی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس حوالے سے خالد یار خان (1963، ص230) لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے گورنر جنرل اور مشاورتی کونسل کا یہ فرض ہوگا کہ ملکی آمدنی میں سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ احیاء اور اصلاح ادب اور ہندوستان کے علماء کی ہمت افزائی اور برطانوی ہند کی رعایا کی علمی ترقی پر خرچ کریں۔''

لیکن حُکامِ وقت نے دس سال تک اس رقم کو استعمال نہیں کیا جس پر ایم الفنسٹن اور الیف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس سیّد طفیل احمد منگلوری (1971، ص ص 168-167) پیش کرتے ہیں:

''انصاف یہ ہے ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کردئے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے لئے تمام ذرائع کو ہٹالیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی کم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اس اِلزام کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔''

اس طرح 1813ء کے قانون اجراء سے کمپنی نے تو علم کا انتظام برائے نام کیا البتہ یورپ کے پادریوں کے لئے اس قانون کی روسے اُس پھاٹک کی کھڑکی کھل گئی جو ابتدائے عمل داری سے پادریوں پر بالکل بند تھا۔ اب وہ لوگ رفتہ رفتہ ہندوستان میں داخل ہوکر جگہ جگہ انگریزی مدارس قائم کرنے لگے۔ 1818ء میں بنارس میں عیسائیوں کا ''جے نرائن کالج'' قائم ہوا۔ 1821ء پونا میں ہندو کالج قائم کیا گیا۔ اس زمانہ میں کلکتہ مدرسہ۔ کلکتہ سنسکرت کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی کلاسوں کا اضافہ کردیا گیا۔ 1823ء میں راجہ رام موہن رائے نے یہ کوشش شروع کی تھی کہ مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے۔ اسی مسئلے کو طے کرنے کے لئے 1834ء میں کمیٹی بنائی گئی۔ لارڈ میکالے اس کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ تب لارڈ میکالے نے اپنا فیصلہ کن ووٹ انگریزی زبان کی تعلیم کی تائید میں دیا۔ انگریزی کے اجراء کی ضرورت پر لارڈ میکالے کے خیالات کا ذکر سیّد شبیر بخاری (1986، ص 33) کرتے ہیں:

''ہندوستان میں تو انگریزی زبان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ
یہ حکمران طبقے کی زبان ہے ملکی باشندوں کے اونچے طبقے کے
لوگ جو صدر مقامات پر رہتے ہیں، وہ بھی انگریزی زبان میں
بات چیت کرتے ہیں یہ امکان بھی ہے کہ یہ زبان سارے
مشرقی سمندروں میں تجارتی زبان بن جائے۔''

تاریخ میں 1854ء کا مراسلہ وڈز مراسلہ کے نام سے موسوم ہے اور تاریخ تعلیم میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چارلس وڈ کے مراسلے میں انگریزی تعلیم کی حمایت کرنے والے آفیسروں کے مئوقف کو شبیر احمد (1974، ص 377) اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

''ہم پوری طاقت سے اعلان کرتے ہیں کہ جو تعلیم ہم
ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں وہ یورپ کے فنون
سائنس، فلسفہ اور ادب کی تعلیم ہے۔''

اس مراسلہ نے اختلاف زبان پر بھی خیالات کا اظہار کیا۔ اسی نے مشرقی علوم کی تدریس کو سراہا اور دیسی زبان کی ترقی وتوسیع پر بھی توجہ دی۔ اس نے کہا کہ ہندوستان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرے اور اس کے لئے اس کو مغربی علوم وزبان کا جاننا ضروری ہے۔ اعلیٰ تعلیم بذریعہ انگریزی دی جائے البتہ ابتدائی تعلیم دیسی زبان میں ہونی چاہیئے۔ انگریزی اور دیسی زبانوں کو اس طرح مشترک کیا جائے کہ ان کا امتیاز ختم ہو جائے۔ اس بارے میں ظفر حسین خان (1975، ص 142) لکھتے ہیں:

''ہماری یہ خواہش نہیں ہے کہ دیسی زبانوں کو ختم کر کے ان کی
جگہ انگریزی کو مسلّط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ فارسی کی بجائے

عدالتوں میں دیسی زبان کورائج کیا ہے۔ دیسی زبانیں اہمیت
اور افادیت کی حامل ہیں لیکن ہندوستان کی ترقی اسی میں ہے
کہ وہ مغربی علوم اور انگریزی زبان سیکھیں۔''

مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو مختلف کمیشنوں اور اسکیموں کے ذریعے تباہ کردینے کے بعد انگریزوں نے انہیں اپنے نوآبادیاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے بھی تعلیم حاصل کرنے نہیں دیا۔ انگریزی سکول کہنے کے لئے تو غیر مذہبی تھے لیکن حقیقتاً ان میں اسلام اور ہندو مذہب اور ملکی قدروں کے خلاف پروپیگنڈا ہوتا تھا۔ جن کی وجہ سے ان میں تعلیم پانے والے لڑکے اخلاق، شرم وحیا، ہمدردی اور محنت کے جذبے سے بے بہرہ ہوجاتے۔ مسلمان ان باتوں کی وجہ سے اپنے بچے ان سکولوں میں بھیجنا پسند نہ کرتے تھے۔ اعلیٰ خاندان کے ہندو بھی اس معاملہ میں مسلمانوں کے ہم خیال تھے جبکہ انگریز تعلیم کے ذریعے مغربی ثقافت کے نفوذ کے خواہاں تھے۔

مغربی ثقافت کا نفوذ

ثقافت (کلچر) کے معانی اور اوصاف مختلف وقتوں میں، علم الانسان کے مختلف ماہرین نے مختلف طور پر بیان کئے ہیں ۔ثقافت (کلچر) کے متعلق ہارن بائی۔ ایس اینڈ اَدرز (Hornby,S and others)(1963، ص238) لکھتے ہیں:

''ثقافت (کلچر) ہماری تہذیب اور تمدّن کی اعلیٰ ترقی ہے۔
اس ترقی میں طبعی ، ذہنی اور روحانی ترقی آجاتی ہے۔ یہ ترقی
تربیت اور تجربے پر منحصر ہوتی ہے۔''

علم الانسان کے ایک ماہر کارٹر-وی گڈ-(Carter.V.Good)(1960، ص350)

کی تعریف کے مطابق:

''ثقافت کسی گروہ، جماعت اور قوم کی معاشرتی، اخلاقی ذہنی، فنی اور صنعتی خوبیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جس کی مدد سے کسی گروہ، جماعت یا قوم کی حیثیت کسی دوسرے گروہ یا جماعت سے الگ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کی مدد سے اس گروہ، جماعت یا قوم کے نظریوں، عملوں، اصولوں اور دستور کا پتہ چل سکتا ہے۔''

اس طرح ہیرلڈرگ (Harold Rugg) (1967، ص350) کی رائے کے مطابق:

''ثقافت لوگوں کی مکمل زندگی کا ایک عکس ہے۔ اس میں لوگوں کی تہذیب وتمدّن، گزرومعاش، رسم ورواج، سوچ بچار، اعتقادوں اور خواہشوں کا بیان آجاتا ہے۔''

ثقافت کے بارے بین الاقوامی شہرت کے مالک تعلیمی ماہر میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (Dr.N.B.Baloch) (1961، ص142) لکھتے ہیں:

''جغرافیائی حالات، انسانی ارتقاء کی تاریخ، زبان اور مذہب سے متاثر ہوکر بنی نوع انسان نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے جو بھی طور طریقے اختیار کئے وہ سب ثقافت کے دائرے میں آجاتے ہیں۔''

ماہرین کی رائے میں ہر وہ عمل اور اقدام جو ایک فرد، ورثے کے طور پر نسل درنسل سیکھتا ہے اور سکھاتا آرہا ہے، ثقافت کے دائرے میں آتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ (1977، ص128)

لکھتے ہیں:

''کلچر تو ہوتا ہی وہ ہے جو نسلاً بعد نسل کے عمل وتعامل سے شکل پذیر ہو۔ میں اینتھروپالوجی والوں کے اس خیال سے متفق ہوں کہ کلچر انسان کے ماحول ثانی کا نام ہے اور ماحول ثانی مسلسل ارتقاء کرتا رہتا ہے۔ مگر ان کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ یہ محض ضروریات وحاجات کی تکمیل کے عمل کا مظاہرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کلچر مادی ماحول میں حسن پیدا کرنے کا نام ہے اور حسن پیدا کرنے والی قوت انسان کے باطن میں ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''

حاصل یہ کہ ثقافت کے دائرے کے اندر لوگوں کی روزانہ زندگی، خوراک، گزرو معاش، لباس، رہن سہن کے طریقے، زبان، رسم ورواج، زراعت، اوراس کے ذرائع آجاتے ہیں۔ مقامی زبانیں اور بولیاں بھی ثقافت کے مطالعے کے دائرے میں آجاتی ہیں کیونکہ وہ لوگوں کے خیالات، اظہار، سوچ وبچار، تخیل اور ذہنی ارتقاء کے مطالعے میں مددگار رہوتی ہیں۔ اس لئے ثقافت ایک طرف انسان کی مادی زندگی کے لئے ضروری اشیاء اوزار، اسلحہ، لباس اور رہائش وغیرہ سے واسطہ رکھتی ہے۔ اور دوسری طرف غیر مادی یعنی روحانی زندگی سے متعلق چیزوں، جیسا کہ زبان، علم وادب، فن، مذہب، اخلاق اور قانون سے بھی نسبت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر حید رسندھی (1985، ص28) رقمطراز ہیں:

''ثقافت کے اندر ہماری اجتماعی زندگی کے وہ سب خارجی امور سمائے ہوئے ہیں جن سے زبان پرورش پاتی ہے اور نشوونما حاصل کرتی ہے۔ ثقافت انسانی تمناؤں اور تقاضوں

کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ ثقافت اپنے لئے ایک مخصوص دنیا تخلیق کرتی ہے۔ جس کی حدیں لاشعوری طور پر انسان کے خیال اور عمل کی حد تک وسیع اور فراخ ہوتی ہیں اور ان حدوں کو صرف زبان کے توسط سے ہی چھویا جا سکتا ہے۔''

ثقافتی ارتقاء کے بارے میں رابرٹ اے ہال (Robert,A.Hall) (1960، ص 121) لکھتے ہیں:

''انسانی ارتقاء کا نظریہ دراصل اسی معاشرے اور ثقافت کی ابتداء اور ارتقاء کا نظریہ ہے۔ کسی تہذیب وتمدّن کی نشو ونما کا مطالعہ دراصل اس معاشرے کی زبان کی ترقی کا تاریخی مطالعہ ہوتا ہے۔ تہذیب وتمدّن کا خالق معاشرہ ہوتا ہے اور زبان معاشرے کے لئے اس آئینے کی مانند ہوتی ہے جس میں اس تہذیب وتمدّن کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی (1985، ص 185) کلچر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کلچر زبان میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لئے زبان کلچر کی ایک اہم ترین علامت ہے۔ جیسا کلچر ہوگا ویسی ہی زبان ہوگی۔ جیسی زبان ہوگی ویسا ہی کلچر ہوگا۔ زندہ زبان معاشرتی تقاضوں سے وجود میں آتی ہے اور خیال اور احساس کے ایک ایسے نظام کو جنم دیتی ہے جس کے ذریعے زبان کا تعلق معاشرے کے مختلف طبقوں سے یکساں ہو جاتا ہے۔ جس میں تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ، ادنیٰ اور اعلیٰ، چھوٹے اور بڑے سب یکساں

طور پر اپنی اپنی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق شریک
ہو جاتے ہیں۔''

انگریزی زبان نے ذہنوں کی ساخت اور تمدّن کی تشکیل کے ضمن میں جو کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے جیلانی کامران (1985،ص58) لکھتے ہیں:

''تاہم ایک تاریخی صداقت البتہ اس نظام تعلیم کے ساتھ برصغیر کے تمدّن میں شامل ہوئی تھی جو انگریزی زبان کے ساتھ منسوب ہے۔ اسی نظامِ تعلیم نے برصغیر میں انگریزی کو رائج کیا اور انگریزی زبان نے ذہنوں کی ساخت اور تمدّن کی تشکیل کے ضمن میں جو کردار ادا کیا ہے اسے اچھے اور بُرے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔''

بلاشبہ تعلیم کا تعلق معاشرے کے ہر جزو، ہر گروہ اور ہر شعبے سے ہوتا ہے۔ خاندان، جماعتیں، سیاست، مذہب، معاشی ادارے، کھیل کود کے ادارے، تفریحی ادارے غرض یہ کہ ہر معاشرتی عمل کا ہر پہلو اس میں شامل ہے۔ ہر قوم اور معاشرہ اپنا ثقافتی ورثہ آنے والی نسلوں میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انگریزوں نے بھی بذریعہ تعلیم اس ورثہ کو برصغیر کے رہنے والوں میں اپنی ثقافت نفوذ کی۔ جس نے یہاں کے رہنے والوں کی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کردی اور مغربی ثقافت کو مشنری درسگاہوں میں نافذ کیا۔ سیّد محمد سلیم (1985،ص14) لکھتے ہیں:

''ان درس گاہوں میں انگریزی، تاریخ، انگریزی معاشرت، انگریزی اخلاق کا بڑا دلفریب نقشہ طالب علموں کے سامنے

پیش کیا جاتا تھا۔ انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں گفتگو کرنا
منع تھا۔''

تعلیم کا اثر طلبہ کے عقائد پر کہاں تک ہوا اس کا اندازہ سرکاری تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ سے ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں شبیر احمد (1974، ص 325) لکھتے ہیں:

''زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے ہیں اور اچھے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے بے چینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا اعلانیہ اظہار کیا جا رہا ہے۔''

تعلیمی نفسیات کے ماہروں کے ہاں یہ امر مسلّم ہے کہ کسی قوم کی اخلاقی اور ذہنی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ قوم خود اپنی مادری زبان کو حصول کا ذریعہ نہ بنائے۔ انگریزی زبان نے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن کر ہندوستانی خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ اس حوالے سے عبداللہ یوسف علی (1994، ص 176) لکھتے ہیں:

''یہ حکومت برطانیہ کی خواہش اور مسلمہ لائحہ عمل ہے کہ اپنی زبان کو ہندوستان میں رفتہ رفتہ اور آخر پورے طور پر سرکاری کاروبار کی زبان بنا دیا جائے۔''

کمپنی کے اربابِ اختیار اور پبلک انسٹرکشن کمیٹی کا یہ پختہ خیال تھا کہ حصولِ علم کے لئے مناسب اور جائز ذریعہ تعلیم کسی طرح کوئی غیر ملکی زبان نہیں بن سکتی۔ لوگوں کو ان کی مادری زبان ہی میں تعلیم و تدریس کا دیا جانا معقول اور قابلِ عمل ہے۔ مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم کے فرائض ادا

کرسکتی ہے۔اس نقطۂ نظر کی روشنی میں جیلانی کامران (1985،ص ص 60-59) لکھتے ہیں:

''ابتدائی تعلیم مادری زبان (ورنیکلر) میں دی جاتی تھی اور آٹھ نو برس کی عمر میں انگریزی زبان کو نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔سرکاری سکولوں کا ذریعہ تعلیم ہائی کلاسوں تک مادری زبان ہی تھا اور مادری زبان کے شانہ بشانہ انگریزی زبان کی تدریس لازمی تھی ۔ مادری زبان انگریزی زبان کی تدریس اور طالب علم کے درمیان رابطے کا کام کرتی تھی ۔اور سکول کے اندر رابطے کی زبان کا کردار ادا کرتی تھی۔''

برطانوی عہد نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب، تمدّن اور فنونِ لطیفہ کو متاثر کیا۔ ادب کے حوالے ڈاکٹر یوسف حسین خان (1948،ص 637) لکھتے ہیں:

''جدید تعلیم کے اثر سے ہندوستان کے مختلف زبانوں کے ادب میں کافی ترقی ہوئی۔گزشتہ زمانے میں ہندوؤں کا ادب اور آرٹ ایک خاص دھارے پر چل رہا تھا اور اس میں یہ مقابلہ ذاتی اُپج کے رسم ورواج اور تقلید پر زور دیا جاتا تھا۔ مغربی تصنیفوں کے اثر سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب نے مغربی اثر قبول کیا۔ رابندرناتھ ٹیگور نے اپنی نظموں، ناٹکوں اور مضامین سے بنگالی زبان کو مالا مال کردیا۔''

انگریزی تعلیم کے ذریعے اہل ہند مغربی تمدّن کے اصول سے واقف ہوئے مغربی تمدّن

کی بنا تقلید پر قائم ہے جو سائنس کی روح ہے۔ سائنس کے ذریعے انسان اپنی زندگی کے وسیلوں کو ترقی دینا اور فطرت کے چھپے ہوئے بھید معلوم کرتا ہے۔ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندوستانی یورپ کی جدید سائنس کے اصول سے آشنا ہوئے مغربی تمدن وفنونِ لطیفہ کی ترقی کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خان (1948، ص 636) لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بعض نامور سائنس دان پیدا ہوئے جن کے نام اس ملک کے باہر بھی عزت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ سر جگدیش چندر بوس، سر سی وی رامن کرشن کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح انگریزوں کے عہد جدید میں ہندوستانیوں نے فنونِ لطیفہ میں بھی کافی ترقی کی۔''

اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی حکومت کے توسّط سے ہندوستان میں یورپ کے جدید خیالات کا گہرا اثر پڑنا شروع ہوا جس نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ انگریزی تعلیم کے باعث ہندوستانیوں کی معاشرتی اور تمدّنی زندگی میں جو عرصے سے آب بستہ کی طرح تھی۔ نئی نئی لہریں اٹھنے لگیں۔ انیسوں صدی کے شروع میں بنگال میں راجا رام موہن رائے نے برہموسماج کی بناء ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو جاتی کی بری رسموں کو ترک کیا جائے۔ اور یورپ کے جدید معاشرتی تمدّن اور خیالات کو قبول کیا جائے۔ اس تحریک سے یہ فائدہ ہوا کہ بنگال اور شمالی ہند کے ہندوؤں میں معاشرتی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ ذات پات اور چھوت چھات کی سختی پہلے مقابلے میں کم ہونے لگی اور پست طبقوں کے انسانی حقوق کو تسلیم کیا جانے لگا۔ مسلمانوں میں سر سیّد احمد خان نے انیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں اس قسم کی تحریک شروع کی تھی۔ اس تحریک کا یہ مقصد تھا کہ مسلمان مغربی تعلیم وتمدّن سے پورا فائدہ اُٹھائیں۔ غرضیکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تعلیم پھیلنے سے بیداری، آزاد خیالی اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوگئی یورپ کے تمدّن کی اصل بنیاد یہی تنقید ہے۔

جدید علوم وفنون کی ترسیل

ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تو ہندوستان کی ساری فضا بدل گئی۔ انگریز حاکم کے ساتھ اس کی زبان انگریزی ہندوستان میں وارد ہوئی۔ انگریزی علوم وفنون آ گئے۔ درس گاہوں میں آہستہ آہستہ انگریزی داخل ہوئی اور ہوتے ہوتے سارے ہندوستان کی سرکاری زبان قرار پائی۔ علمی، ادبی زبان بن گئی۔ مغل حکومت کے زوال کے ساتھ اسلامی علوم میں بھی ہندوستان میں زوال آ گیا۔ ان کی وہ قدر نہ رہی۔ پروفیسر رشید امجد، سیّد فاروق علی (1980، ص 141) لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں علم وفنون روبہ تنزل ہیں۔ نہ صرف یہ کہ عالموں کی تعداد میں کمی ہوگئی ہے بلکہ یہ کہ حلقہ علم بہت محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ اعلیٰ علوم کی تعلیم منقطع ہوگئی ہے ادب سے توجہ ہٹ گئی ہے۔ سوائے مذہبی واقفیت اور شرعی علوم کے سب علوم کی تعلیم لوگوں نے ترک کردی ہے۔ ان حالات میں انگریزی کی تعلیم شروع ہوئی اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔''

راجہ رام موہن رائے نے علوم شرقیہ کے مقابلے میں مغربی علوم کی حمایت کے لئے ایک میمورنڈم تحریر کیا جسے لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل کو پیش کیا گیا۔ یہ میمورنڈم راجہ رام موہن رائے نے خود انگریزی میں تحریر کیا تھا۔ اس میمورنڈم کے حوالے سے جیلانی کامران (1985، ص 30) لکھتے ہیں:

''جب ہمیں اس امر کا علم ہوا کہ حکومت ایک اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ قائم کرنا چاہتی ہے اور اپنی ہندوستانی رعایا کے لئے حکومت انگلیشیہ نے ایک خطیر رقم بھی مختص کردی ہے تو ہمارے دل امید کی کرنوں سے روشن ہوگئے کہ اس خطیر رقم کے ساتھ قابل یورپین اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں گی اور وہ دیسی رعایا کو ریاضی، فلسفہ، کیمسٹری، اناٹومی اور دیگر سودمند علوم سے فیض یاب کریں گے۔''

انگریزی زبان کی لازمی تدریس کے حق میں جیلانی کامران (1985،ص ص39-40) مزید لکھتے ہیں:

''حکومت نے انگریزی زبان کو نافذ کرکے دانشمندی کا یقیناً ثبوت دیا ہے کہ اس طرح اس زبان کے ذریعے برصغیر کے نوجوان نہ صرف، انگریزی ادب ہی سے آشنا ہونگے بلکہ سائنس کے علوم سے بھی بہرہ مند ہوسکیں گے انگریزی زبان سے نہ صرف ذہنوں میں انقلاب پیدا ہوگا اور بالآخر حکومت کے اس اقدام کی اچھائیاں آشکار ہوں گی۔ انگریزی زبان کے لازمی تدریسی کردار کے ذریعے صداقت پھیلے گی اور جھوٹ کے قدم اُکھڑ جائیں گے۔ ہمارا ادب اور ہماری سائنس صداقت کے پھیلنے میں برابر مدد دیتی رہے گی۔''

برصغیر میں انگریزوں کے تسلّط کے بعد تعلیم کا جو دَور شروع ہوا وہ فی الحقیقت جدید علوم وفنون کی تعلیم کا دَور ہے۔ لیکن اس دَور میں بھی جدید علوم وفنون کی تعلیم کے جو قافلے تیار ہوئے ان

ہو جائے گا۔ جس کے طالب علم اس ملک کے ہر چہار طرف
آزادانہ تحقیقات اور فراخ حوصلہ، بے تعصّبی اور عمدہ اخلاق کی
بشارت دیتے پھریں گے۔''

مغربی علوم کی ترویج واشاعت سر سیّد احمد خان کی مساعی سے مسلمانوں میں مقبول ہونے لگی۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نمونہ پر ملک کے دوسرے شہروں میں کالج کھلنے لگے۔ پروفیسر سیّد محمد سلیم (1989،ص205) لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے جنوب مغرب میں مغربی تعلیم کی اشاعت کا
کام انجمن اسلام نے انجام دیا۔ جو 31 مارچ 1874ء میں
بمبئی میں قائم ہوئی اور 1880ء میں مغربی تعلیم کے لئے پہلا
اسکول کھول۔ اس انجمن نے بمبئی کے مسلمانوں میں جدید
بیداری کی رَو پیدا کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔''

سر سیّد احمد خان کے نزدیک جدید طریقہ تعلیم سے مراد اہل برطانیہ کا طریقہ تعلیم تھا جس کے مطابق تعلیم با قاعدہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی تھی، یہ تعلیم ہمہ گیر تھی۔ اس میں زبان وادب، تاریخ، سیاست، معاشیات، حساب، ادیان، فلسفہ، منطق، صحافت، فزکس، کیمسٹری، قانون، طب، انجینئرنگ غرض تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی جو نہ صرف انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی تھی بلکہ تحقیق اور جستجو سے نئی نئی ایجادات وجود میں لاکر بنی نوع انسان کی تہذیب وثقافت کو چکا چوند کر رہی تھی۔ سر سیّد احمد خان نے جدید تعلیم کے کام کو انجام دینے کے لئے متعدد طریقے اختیار کئے۔ بقول خالد یار خان (1963،ص258):

کی رہنمائی کی باگ ڈور انہیں بزرگوں کے ہاتھ میں تھی جنہیں دَور گذشتہ کے دست تعلیم و تربیت نے بنایا اور سنوارا تھا۔ انہیں بزرگوں نے علی گڑھ، لکھنو، لاہور، کلکتہ، کراچی، دکن وغیرہ میں جدید علوم و فنون کی درسگاہیں قائم کیں۔ جدید علوم و فنون کی ترسیل اور قیام مدارس کے حوالے سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری (1974-1973، ص18) لکھتے ہیں:

> ''جدید دَور تعلیم کا آغاز دہلی کالج کی ایک مستثنٰی مثال کے سوا1857ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دَور میں شمالی ہند میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ، مشرق میں مدراس، کلکتہ کی جامعات، جنوب میں دارالعلوم نواب سالار جنگ، حیدرآباد، جنوب مغربی علاقے میں انجمن اسلام سکول بمبئی اور سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی، شمال مغرب میں پنجاب یونیورسٹی کالج اور اسلامیہ کالج لاہور اور بعض دوسرے مدارس قائم ہو گئے۔''

سر سیّد احمد خان نے جدید علوم کی ترسیل کے سلسلے میں عملی میدان میں ایک قدم اور بڑھایا اور 8 جنوری 1877ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن سے کالج کا سنگِ بنیاد نصب کرایا۔ تنصیب سنگِ بنیاد کی اس تقریب میں جو سپاس نامہ پیش ہوا۔ اُس میں کالج کی کامیابیوں اور اُمیدوں کے بارے میں نذیر چوہدری (75-1974، ص81) بیان کرتے ہیں:

> ''جو بیج آج ہم بوتے ہیں۔ اس سے ایک ایسا درخت پیدا ہوگا جس کی شاخیں اس ملک کے بڑے درخت کی مانند پھر زمین میں مضبوط جڑیں پکڑ لیں گی اور ان سے نئے نئے قوت دار پودے پیدا ہوں گے۔ ایک دن یہ کالج پھیل کر یونیورسٹی

''آپ نے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام تہذیب الاخلاق رکھا۔اس رسالہ کے ذریعہ آپ نے مغربی تعلیم کی تبلیغ شروع کی۔''

مشرقی ہندوستان (بنگال، بہار وغیرہ) میں اشاعت تعلیم کا کام جسٹس امیر علی نے انجام دیا۔ان کی والدہ انگریز تھی اور بیوی بھی انگریز تھی۔ وہ لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے ہم زلف تھے۔انہوں نے سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن 1877ء میں کلکتہ میں قائم کی۔اس ایسوسی ایشن کے مقاصد کے بارے میں پروفیسر سیّد محمد سلیم (1989،ص206) لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا، برطانوی تاج کی پوری وفاداری کرنا، مغربی تہذیب اور جدید رجحانات کی ہمت کرنا۔اس لئے بنگال میں اسکول، کالج قائم کر کے مغربی تعلیم کو فروغ دیا۔''

سر سیّد احمد خان کی خدمات کے صلہ میں جو خراج تحسین تاریخ نے آپ کو عطا کیا ہے وہ یہ ہے:''اس بات کو اب سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ مسلمانان ہند میں نشاۃ ثانیہ کے بانی ہیں۔ آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا آغاز کیا اور آپ کی کوششوں سے مسلمان مغربی تعلیم کو پسند کرنے لگے۔''

عیسائیت کا پرچار

انیسویں صدی سے قبل یورپین افراد نے جو سرگرمیاں اشاعت تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان میں خود اپنی قوم یا دوسرے مقامی باشندوں کے لئے کیں۔ بلاشبہ یہ سرگرمیاں مذہبی

(عیسائی) عقائد کے نشر و اشاعت کے لئے تھیں ۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیرونی تاجروں کے زیر اثر تعلیم کی اشاعت و ترویج کا اصل مقصد اور منشاء ہندوستانی باشندوں میں مذہبی تبلیغ تھا۔یعنی مسیحیت کا پرچار۔ دوسری اہم غرض یہ تھی کہ ان ہندوستانی علاقوں میں جہاں انگریز تاجر آباد ہو گئے تھے۔رومن کیتھولک فرقے کی اکثریت کی وجہ سے جن خطرات کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ان کو زائل کیا جائے۔

ان یورپین نو واردوں کا بنیادی منشاء مسیحیت کی تبلیغ تھا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے مذہبی تعلیم کی ابتداء کی۔اور اس کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کیلئے وہاں کے باشندوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینی شروع کی ۔ ساتھ ساتھ ان یورپین نو واردوں نے خود بھی مقامی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مقامی زبانوں کا سہارا لیکر ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم سے واقف کرانا تھا۔تاکہ حصول تعلیم کے بعد ہندوستانی، مسیحی مذہب کی تعلیمات کو بہتر طریقے پر سمجھ سکیں۔ایسے اقدامات کے متعلق ڈاکٹر این۔این۔لاء (1972،ص120) لکھتے ہیں:

> ''ہندوستانیوں کو اپنے ہم وطنوں میں دین مسیحی کی تبلیغ کرنے کی غرض سے بھرتی کیا گیا اور کمپنی کے خرچ پر ان ہندوستانی پادریوں کو ایسی تعلیم دی گئی جس کے حصول کے بعد وہ اس مقصد کو مؤثر طریقے پر پورا کر سکیں۔جس کے لئے ان کو بھرتی کیا گیا تھا۔''

یورپین افراد کی اس (ہندوستان) ملک میں اٹھارویں صدی کے آخر تک اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے معاملے میں سب سے زیادہ سرگرمی پادریوں اور مشنریوں نے دکھائی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خان (1975،ص19) رقمطراز ہیں:

''ان میں قابل ذکر انگریز مشنریوں کی جماعت ہے۔ جنہوں
نے انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں بھی تعلیم کو عیسائیت
کی تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوششیں کیں۔ اس لحاظ سے مشنری
جماعت کی بالکل مخلصانہ خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کے لوگوں
کو انگریزی تعلیم دے کر سچے مذہب کی روشنی پہنچائی جائے۔''

مذہب عیسوی (عیسائیت) کے متعلق سر چارلس ٹریولین کے خیالات اور توقعات کو سیّد طفیل احمد منگلوری (1971، ص 175) یہ تھے:

''میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کُل کے کُل ایک
ساتھ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی سب کے سب
عیسائی ہوجائیں گے۔ ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم
بلاواسطہ پادریوں کے ذریعہ اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں
اور یورپینوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعے نفوذ کرے
گی۔ حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائیٹی میں نفوذ کر جائیں گے۔
تب ہزاروں کی تعداد عیسائی ہوا کریں گے۔''

انگریزوں نے اس ملک میں قدم جمائے تو انہوں نے اپنی ضروریات کے مطابق ایک ایسا نظام تعلیم رائج کیا جس کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا تھا جو غلامانہ ذہنیت رکھتے ہوں اور انگریزوں کی حکومت کو مضبوط کرتے ہیں ان کے معاون ثابت ہوں۔ اس لئے انگریزوں کی حکومت کا واضح مقصد انگریزی زبان اور مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ تا کہ یہاں کے لوگ مغربی تہذیب اور مغربی مذہب کو قبول کرلیں۔ اور انگریزی زبان جاننے والے ایسے مشینوں اور کلرکوں کی فوج تیار کرنا تھا۔ جو حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا کام دیے سکیں۔ جب تک ایسے

کلرکوں کی ایک معقول تعداد تیار نہیں ہو جاتی اسوقت تک مسلمانوں کے نظام تعلیم کو بوجہ مجبوری گوار کیا گیا۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو مختلف کمشنوں اور اسکیموں کے زریعے تباہ کر دینے کے بعد انگریزوں نے انہیں اپنے نو آبادیاتی نظام تعلیم کے زریعے بھی تعلیم حاصل کرنے نہیں دی۔ انگریزی سکول کہنے کو تو غیر مذہبی تھے لیکن حقیقتاً اِسلام اور ہندو مذہب اور تدروں کے خلاف پراپگینڈا ہوتا تھا جن کی وجہ سے علم تعلیم پانے والے لڑکے اخلاق شرم وحیا ہمدردی اور محنت کے جذبے سے بے بہرہ ہو جاتے۔ جبکہ انگریز تعلیم کے ذریعے مغربی ثقافت کے نفوذ کے خواہاں تھے۔ انگریزی تعلیم کے ذریعے اہل ہند مغربی تمدن کے اصول سے واقف ہوئے۔ ہندوستانیوں نے فنون لطیفہ میں کافی ترقی کی تاہم ہندوؤں اور مسلمان دونوں میں تعلیم پھیلنے سے بیداری، آزاد خیالی اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ سر سیّد احمد خان نے جدید علوم کی ترسیل کے سلسلے میں عملی میدان میں ایک قدم اور بڑھایا اور وائسرائے ہند لارڈ لٹن سے کالج کا سنگ بنیاد نصب کرایا۔ اس کالج کے نمونے پر ملک کے دوسرے شہروں میں کالج کھلنے لگے۔ اس لئے سر سیّد احمد خان کی خدمات کے صلے میں اس بات کو اب سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ سر سیّد نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا آغاز کیا۔ اور اپ کی کوششوں سے مسلمان مغربی تعلیم کو پسند کرنے لگے۔ انگریزوں کا بنیادی منشاء مسیحیت کی تبلیغ تھا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے مذہبی تعلیم کی ابتداء کی، اور تعلیمی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ سرگرمی پادریوں میں اور مشتریوں نے دکھائی۔ برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کے اجزاء، انگریزی تعلیم کے مقاصد، انگریزی زبان کی ترویج، مغربی ثقافت کا نفوذ، جدید علوم وفنون کی ترسیل اور عسائیت کا پرچار ہی دراصل وہ معیّنات تھے جن پر برطانوی نظام تعلیم کی بنیادیں استوار کی گئیں جو اسلامی نظام تعلیم سے متضادم تھا۔

نظامِ تعلیم ایک جامع اور وسیع المعنی اصطلاح ہے۔ اس کُل کے بہت سے اجزا اور اس عمل کی بہت سی جہتیں ہیں۔ جب تمام اجزاء جن ترتیب اور حسن توازن کے مظہر ہوں تو نظام کا ہیولیٰ

تیار ہوتا ہے۔ جب سارے راستے ایک ہی منزل پر پہنچانے والے ہوں تو یہ تحرّک ایک نظام کو جنم دیتا ہے۔ برصغیر میں برطانوی نظامِ تعلیم کے اجزاء اِسلامی نظامِ تعلیم سے متضاد تھے۔ ان میں ارتباط کم بلکہ بُعد بہت زیادہ تھا۔ اس لئے برطانوی نظامِ تعلیم کے معیّنات اس خطہ میں ایک اکائی کے طور پر نہ اُبھر سکے۔

باب چہارم

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کا دینی اور تہذیبی کردار

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم کے آغاز اور عروج کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام (یکم ہجری) 622ء کے ساتھ ساتھ ان مدارس کا قیام بھی عمل میں آ گیا تھا۔ مسجد نبوی کا صُفّہ ___ (چبوترا) ___ اسلام کا پہلا مدرسہ تھا۔ صحابہ کرام پہلے طالب علم تھے اور رسول اکرمؐ پہلے استاد تھے۔ اصحاب صفہ میں سے کچھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود ہی تگ ودو کرتے تھے، پھر مسلمانوں کے اہل ثروت ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دل کھول کر عطیات، وظائف دیتے تھے۔ اور حضور اکرمؐ خود ان کی ضروریات پوری فرماتے تھے۔ بلکہ جب تک ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہو جاتا آپ ﷺ کھانا تناول نہ فرماتے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی ہے۔

پہلی چار صدیوں میں باقاعدہ مدارس کا نظام موجود نہ تھا۔ لیکن تعلیم وتعلّم کے لاکھوں حلقے اس نہج پر کام کر رہے تھے جو صفہ کی تعلیم گاہ میں قائم ہوئی تھی۔ مساجد تعلیم کا مرکز تھیں اور حلقہ ہائے درس قرآن وحدیث تعلیم کا ذریعہ۔ اس دَور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جواب تک موجود ہیں اور اپنا ایک مخصوص مقام رکھتی ہیں مسجد الحرام (مکہ مکرمہ) اور مسجد نبویؑ کے علاوہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامع ازہر ہیں۔ یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دَور ہے۔

دوسرے دَور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ بڑے پیمانے پر مدارس قائم ہوئے۔ اس حوالے سے پروفیسر خورشید احمد (1977، ص72) لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلا مدرسہ 410ھ سلطان محمود غزنوی نے غزنی میں قائم کیا۔ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ، وقف املاک برائے عام خرچہ جات اور نصابِ تعلیم وغیرہ تھے۔''

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کا آغاز شہاب الدین غوری کے عہد سے ہوا۔ جو اپنے معتمد علیہ غلام قطب الدین ایبک کو یہاں حکمران مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال حکمران مسلمان رہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی علم پر اجارہ داری کو توڑ ڈالا اور تعلیم کو اس دَور کے مزاج کے مطابق ہر باصلاحیت فرد کے لئے عام کر دیا۔ سلاطین، امراء، علماء اور اہل ثروت نے انفرادی اور اجتماعی کوششیں جاری رکھیں۔ ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کی اشاعتِ تعلیم اور دینی تعلیم کے لئے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں پروفیسر امیر الہدیٰ (1973، ص 322) لکھتے ہیں:

> ''برصغیر کے مسلمانوں نے یہاں کی تمام قوموں سے بڑھ چڑھ کر علوم کی اشاعت و ترقی میں حصہ لیا۔ مسلمانوں میں یہ عام رواج تھا کہ وہ مسجد کے ساتھ ساتھ ایک مدرسہ بھی تعمیر کراتے تھے۔ جہاں دینی علوم کے ساتھ دُنیوی علوم کا بھی درس دیا جاتا تھا۔''

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے دینی کردار کے حوالے سے چند اجمالی امور کی تشریح و توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم فارسی تاریخوں میں ہندوستان کے گزشتہ مدارس اور تعلیم گاہوں کے کام کن کن عمارات و اماکن سے لئے جاتے تھے۔

''ہر خانقاہ میں تشنہ لبان تصوف و علومِ باطن کی طرح طالبین
علوم ظاہر کی جماعت کثیر بھی پائی جاتی تھی، اس بنا پر قدیم
خانقاہیں مدارس و مکاتب کے سلسلے میں شمار کی جاتی تھیں۔''

قدیم زمانہ میں تعلیم کے لیے عموماً علیحدہ علیحدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں، بڑے بڑے مقبرے اور روضے اسی غرض سے تعمیر کیے جاتے تھے۔ اِس حوالے سے ابوالحسنات ندوی (1992،ص1) لکھتے ہیں:

''سلاطین اور بزرگان دین کرام کی قبروں پر جو مقبرے اور
روضے تعمیر ہوتے تھے ان کے ساتھ اردگرد بہت سے حُجرے
اور کمرے اسی غرض سے تعمیر کیے جاتے تھے کہ وہ مدرسوں کے
کام میں آئیں۔ مقبرہ علاؤالدین خلجی اور مقبرہ ہمایونی اس کی
درخشندہ مثال ہیں۔''

ابتداً اسلامی تہذیب سے مراد عربوں کی تہذیب تھی۔ ان کی شاعری۔ قبائلی روایات وآثار پر مشتمل تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں ایرانی، عراقی، شامی اور مصری تہذیب کے اجزاء شامل ہوتے گئے اور ہر ملک میں اسلامی تہذیب کا رنگ بدلتا گیا۔ بنیادی تصوّرات تو وہی رہے لیکن علاقائی روایات کی وجہ سے اس کی صورت تبدیل ہوگئی۔ تہذیب کے حوالے سے ڈاکٹر سیّد عبداللہ (1977،ص6) رقمطراز ہیں:

''تہذیب کلچر کے معنوں میں، انفرادی واجتمائی، ذوقی
واخلاقی اور معاشرتی رویےّ اوراجتماعی عادات کے معنوں
میں اس میں فنون بھی شامل ہوں گے اور علوم بھی اور عادات

- تاریخ کی کتب میں سلاطینِ اسلام کے اعمالِ زندگی کے بارے میں یہ الفاظ فارسی میں ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عمارات وبقاع خیر سے مراد مدرسے، کتب خانے، مسجدیں اور خانقاہیں ہیں۔

- قدیم زمانہ میں تعلیم کے لئے عموماً علیحدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں، زیادہ تر یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا، اس زمانہ کی تمام مسجدیں مدارس کا کام دیتی تھیں۔اس لئے ہر قدیم وسیع مسجد ایک بڑی درس گاہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم قدم پر وسیع اور شاندار مسجدیں ملیں گی۔

- دہلی، آگرہ، لاہور، جونپور، احمد آباد، گجرات وغیرہ قدیم اسلامی دارالسلطنت ہائے میں جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں اور جواب تک باقی ہیں ان کی ہیت کذائی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ تعلیم گاہوں کے کام میں آتا تھا، ان مسجدوں میں اب تک صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حُجروں کا وسیع سلسلہ ہے۔ درحقیقت یہ طلبہ اور مدرسین کے رہنے کے مقامات تھے۔ان میں بعض اب تک اسی کام میں ہیں۔ مثلاً دہلی کی مسجد فتح پوری واکبرآبادی 1060ھ میں تیار ہوئیں۔وسیع صحن کے گرداگرد جو کمرے بنائے گئے ہیں وہ خاص طور پر طلبہ کی اقامت گاہ ہیں اور وہاں سے طلباء وعلوم عربیہ کی ایک بڑی جماعت آج بھی فیض یاب ہو رہی ہے۔

قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم گاہوں کے مَصرف میں آتی تھیں، متصوفین اور گوشہ نشین مشائخِ زمانہ اس وقت صرف مجاہدۂ نفس ووظائف ہی کو عبادت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ شریعت وطریقت اور ظاہر و باطن دونوں کی تعلیم وتدریس کو اپنا حقیقی نصب العین خیال کرتے تھے، اسی وجہ سے قدیم مشائخ وبزرگانِ دین کے حالات میں درس وتدریس کا شغل عموماً نظر آتا ہے۔اس حوالے سے ابوالحسنات ندوی (1992، ص 17) لکھتے ہیں:

واخلاق بھی۔معنوی لحاظ سے شاید لفظ تہذیب ہی کلچر کا قریبی
مترادف ہے۔تہذیب کسی تمدن کے آزادانہ نشوونما پانے حصے
یا رخ کو کہتے ہیں۔''

عباسیہ دَور کے بغداد میں تہذیب نے علم وحکمت کی صورت اختیار کر لی۔ایران میں پہنچ کت یہ نقاشی، مصوری اور شاعری میں ڈھل گئی۔ ہندستان میں حسین عمارات کا قالب اختیار کرلیا اور ہسپانیہ میں یہ عظیم درسگاہوں اور لائبریریوں میں بدل گئی۔اس اختلاف وتنوّع کے بارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ (1977،ص15) مزید لکھتے ہیں:

''یہ اختلاف وتنوّع دیگر اقوام میں بھی نظر آتا ہے۔مصر کی
پرانی تہذیب تعمیراتی تھی۔جس کا اظہار اہرام کی صورت میں
ہوا۔قدیم یونان کی تہذیب عقلی تھی۔قدیم چین کی
مصورانہ، ہند کی ہرزمانے میں صنم یاتی رہی۔''

ہندوستان میں مسلم تہذیبی سرگرمیوں کا آغاز فتح سندھ کے ساتھ ہوگیا تھا۔محمد بن قاسم محض ایک فاتح نہیں تھا بلکہ وہ ایک نئے نظامِ حیات کا پیامبر بھی تھا۔اس نے وادی سبدھ میں اپنی مہمات کے ذریعے جنوبی ایشیا میں دُوررس تبدیلیاں کیں۔جن کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں آریاؤں کی آمد کے بعد محمد بن قاسم کا حملہ اس علاقے کا اہم ترین عہد ساز واقعہ ہے۔اس علاقے کی تاریخ اور تہذیب وتمدن کو بنیادی طور پر متاثر کیا۔اس سے پہلے آنے والے حملہ آور جنگی کامیابیوں کے باوجود ہندوتہذیب وتمدّن صنم ہو جاتے تھے۔مگر مسلمانوں کے حملے کے بعد یہ تہذیبی عملاً الٹ چلنے لگا اور مسلمانوں نے نہ صرف بے شمار مقامی باشندوں کو حلقہ اسلام میں شامل کردیا بلکہ ہندوتہذیب وتمدّن پر بھی انمٹ نقوش رقم کیے شیخ محمد اکرام (1964،ص24) لکھتے ہیں:

''محمد بن قاسم ہندوستان میں قریباً چار سال رہا جو ترکوں اور افغانستان کی بہ نسبت زیادہ رواداری اور رعیت پروری پر مبنی تھا۔''

چچ نامہ کی روایت کے مطابق محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ تمام ضروری مقامات پر مسجدیں بنا دی گئی ہیں۔ان مساجد میں وقت پر خطبے ہوتے ہیں۔اس ابتدائی دَور میں سندھ کے دو شہر دیبل اور منصورہ اسلامی علوم کے مرکز بن گئے تھے۔

غزنوی عہد

محمود غزنوی تقریباً 32 سال حکمران رہا۔1030ء میں جب اس کی وفات ہوئی تو اس کی حکمرانی کا دائرہ افغانستان، خراسان اور ایران و ترکستان کے وسیع قطعات اور موجودہ پاکستان کے علاقے اس میں شامل تھے۔محمود غزنوی نے اپنے دارالسلطنت (غزنی) میں ایک عظیم الشان مسجد اور اس کے ساتھ بہت بڑا کتب خانہ اور دارالعلوم قائم کیا۔

صوبہ سرحد و پنجاب کے سلطنت غزنوی میں الحاق کے نتیجے میں فضا ہی بدل گئی اور جگہ جگہ مسلمانوں کی آبادیاں قائم ہوگئیں۔صدہا مدارس اور مساجد تعمیر ہوگئیں۔عربی، فارسی کی تعلیم پھیل گئی۔مشہور شاعر عرفیؔ نے اپنے تذکرہ میں ایک علیحدہ باب ''شعراء غزنویہ لاہور'' کا قائم کیا ہے۔محمود کے انتقال کے دس سال بعد حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور تشریف لائے۔آپ کی آمد سے رشد و ہدایت کی محفلوں میں جان پڑ گئی۔اس دَور کا مسلمان قرآن اور قرآنی تعلیمات کے قریب تھا۔اور اس نے حصولِ علم کو اپنا فرض سمجھا۔دَور غزنی کو ہندوستان میں مدارس اور مکاتب کے قیام کی روایت کا نقطہ آغاز قرار دیتے ہوئے مولانا ابوالحسنات ندوی (1992، ص2) لکھتے ہیں:

''مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس، مکاتب کے قیام کا عام مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کے امراء کے توسّط سے ابتداء یہ طریقہ ہندوستان میں داخل ہوا اور بعد کو رفتہ رفتہ رواج پا گیا۔''

ہندوستان میں دوسرے مسلم عہد کا آغاز سلطان محمود غزنوی سے ہوا۔ محمود غزنوی کی معارف پروری اور علم نوازی کی داستانیں ہمارے تہذیبی ورثے کا مسرت انگیز سرمایہ ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کی علم دوستی اور معارف پروری کی بناء پر اس کا دارالحکومت (غزنی) ایک عظیم الشان علمی وتہذیبی مرکز بن گیا۔ محمود غزنوی سے یہ اعزاز بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ اسلامی دنیا میں مسجد سے الگ تھلگ سب سے پہلا باقاعدہ مدرسہ اس نے ہی 410ھ میں غزنی میں قائم کیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی معارف پروری پر سالانہ چار لاکھ دینار سے زیادہ رقم خرچ کرتا تھا۔ حاکمِ وقت کی معارف پروری کے اثرات یہاں بھی پیدا ہوئے۔ اِن اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد شجاع الدین (س ن، ص 28) لکھتے ہیں:

''اس عہد میں غزنوی سلطنت کا دوسرا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی علم وفضل کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں بے شمار مسلمان خاندان دوسرے ممالک سے تلاشِ معاش، سرکاری ملازمت یا تبلیغِ دین جیسے مقاصد کے لئے لاہور میں آباد ہو گئے۔ مقامی باشندے بھی جوق در جوق مسلمان ہونے لگے اور یہاں ایک مسلم سوسائٹی وجود میں آ گئی۔''

سلاطین دہلی کا عہد

سلاطین دہلی کا دَور قطب الدین ایبک سے شروع ہو کر ابراہیم لودھی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دَور کئی اعتبار سے معروف ہے۔ اوّل ہندوستان میں ایک مسلمان سلطنت کا قیام، دوم، اسلام کی تبلیغ وتوسیع، سوم، علم وفن کی ترقی اور چہارم فنِ تعمیر کے نادر تجربے، بے شمار مساجد اور مقابر اس دَور کی زندہ یادگار ہیں۔ قطب الدین ایبک علم وادب کا بہت دلدادہ تھا اور اُس نے اپنے گرد علماء وفضلاء کا ایک گروہ جمع کر رکھا تھا۔ وہ خود پڑھا لکھا تھا علماء کی قدر دانی اور تعلیم شناسی کے متعلق شیخ محمد رفیق (1991، ص79) لکھتے ہیں:

> ''قطب الدین ایبک ملک میں تعلیم کو عام کرنے میں علماء کی بہت قدر کرتا تھا اور اُن کی خدمات کے پیشِ نظر انہیں وظائف، انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ اسی وجہ سے اُسے لکھ بخش کہا جاتا تھا۔''

قطب الدین ایبک کو نہ صرف ہندوستان میں اوّل مُسلم بادشاہ ہونے کا فخر حاصل ہے بلکہ اُس نے ہندو فنِ تعمیر میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا امتزاج پیدا کرنے میں بھی پہل کی۔ اسے فنِ تعمیر کا بہت شوق تھا اُس نے ایسی خوبصورت عمارت تعمیر کرائیں جو آج بھی اس فنِ تعمیر کے اعلیٰ ذوق کا ثبوت ہیں۔ قطب الدین ایبک کے ذوقِ عمارت کے حوالے سے پروفیسر غلام رسول (س ن، ص49) لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی سرزمین پر قطب الدین ایبک نے بعض عمارتیں بطور نشانی چھوڑی ہیں جو پائیدار اور ایک عزم کا اظہار کرتی ہیں۔''

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد سلطان شمس الدین التمش تخت نشین

ہوا۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ التمش کو علماء، شعراء اور صوفیاء سے خاص شغف تھا، بادشاہ شمس الدین اطاعتِ الٰہی اور عبادت میں دوام اختیار کرتے، فرائض اور نوافل کی ادائیگی کے لئے قیام کرتے۔ اُس کا صوفیاء کرام سے خاص شغف اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے لگاؤ کے بارے میں قاضی جاوید (1995، ص 39) لکھتے ہیں۔

''صوفیاء کی خانقاہیں فکر و دانش اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن گئی تھیں، التمش خود فقر دوست تھا، وہ راتوں کو جاگتا تھا اور کسی کو بیدار نہیں کرتا تھا۔ وہ نہایت عابد و زاہد، صوفی منش اور فکر پسند طبیعت کا مالک تھا۔''

مسلمان بادشاہ اپنے سکوں پر اپنا نام ناگری اور کبھی کبھی عربی رسم الخط میں لکھا کرتے تھے۔ اور ہندومت کی علامات مثلاً دیوتا، شیو کا بیل چوپان راجہ گھوڑے پر سواری کرتے دکھائے جاسکتے تھے۔ سلطان التمش کا عربی زبان سے لگاؤ کے متعلق پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد غوری (1989، ص 185) لکھتے ہیں:

''سلطان التمش پہلا حکمران بادشاہ ہے جس نے مکمل طور پر عربی میں لکھے ہوئے سکےّ جاری کئے اور چاندی کے سکے کو رواج دیا۔ اس طرح ہندو علامات سکوّں سے ختم کیں۔''

سلطان ناصر الدین محمود نے بھی اپنے عہد میں معارف پروری کا حق ادا کیا۔ محمود کے دربار کے بارے میں مولوی عبدالحی (1864، ص 75) لکھتے ہیں:

''یہ دربار علماء و فضلاء سے پُر ہے یہ ایک ایسا آسمان ہے جس میں اربابِ کمال کے ستارے چمکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بوستان

ہے جہاں فضل کی کلیاں اور ہنر کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔''

سلاطین دہلی میں ایک بڑا نام غیاث الدین بلبن کا آتا ہے۔ اسکے عہد میں نئے مدرسے کی تاسیس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن جن علماء مثلاً امیر خسرو، شیخ عثمان مروندی، شیخ بدرالدین عارف، امیر حسن دہلوی، فریدالدین شکرگنج، بہاءالدین زکریا اور مولانا قطب دین سے اسے تعلق خاطر تھا۔ وہ بجائے خود ایک ادارہ تھے اور اپنی اپنی جگہ فروغِ علم وفن اور توسیع اسلام کے کاموں میں مصروف تھے۔

بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد، علم وادب کا دلداہ تھا شاعری سے خصوصی لگاؤ رکھتا تھا۔ بلبن بھی اپنے آزاد خیال اور معارف پرور شہزادہ کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے شہزادے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا جس کا تذکرہ محمد قاسم فرشتہ (1969، ص265) کرتے ہیں:

''عقل مند، عالم اور بہادر لوگوں کی تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھو۔ ان پر ہمیشہ مہربان رہو اور ان کی مدد سخی لوگوں کی طرح کرو۔ ایسے لوگ تمہارے مشوروں کے روحِ رواں ہیں اور وہ تمہارا اقتدار قائم رکھنے میں معاون رہیں گے۔''

عاقلوں اور عالموں کی تلاش میں شہزادہ محمد نے شیخ سعدی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ زادِراہ اور تحائف بھی ارسال کئے اور ارادہ ظاہر کیا کہ شیخ کے شایان شان خانقاہ تعمیر کی جائے گی مگر شیخ نے شیراز کے گلزاروں کو ملتان کے ریگ زاروں کے لئے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ شیخ سعدی کے علاوہ شہزادہ محمد نے شیخ عثمان مروندی (لال شہباز قلندر) کو بھی ملتان میں قیام کرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ضیاءالدین برنی (1985، ص ص 68-67) لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں شیخ عثمان (مروندی) جو بڑے بزرگ

تھے۔ ملتان پہنچے تو شہزادہ محمد جو انہیں جانتا تھا ان کا معتقد تھا، نے ان کی بہت زیادہ تواضع کی اور بہت زیادہ نذرانہ پیش کیا۔ اور بہت کوشش کی کہ انہیں ملتان میں روک لے اور ان کے لئے خانقاہ بنا دے اور بہت گاؤں دے دے۔ لیکن شیخ عثمان نہ ٹھہرے۔''

مورخ ضیاء الدین برنی کا عمومی رویہ علاؤ الدین خلجی کے بارے میں اچھا نہیں۔ پھر بھی وہ تسلیم کرتا ہے کہ علائی عہد میں دارالسلطنت علم و دانش کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اس شہر میں اصولِ دین، نحو، تفسیر، فقہ، اصول فقہ کے اتنے ممتاز علماء جمع تھے کہ ان کا مقابلہ بخارا، سمرقند، بغداد، قاہرہ، دمشق، اصفہان اور تبریز کے عالی مرتبت علماء بھی نہیں کر سکتے تھے۔ علائی عہد کے مشہور علماء و فضلاء کے نام قاضی جاوید (1995، ص 43) لکھتے ہیں:

''جمال الدین شاطبی، علاؤ الدین مقری، خواجہ ذکی، قاضی شرف الدین سرماہی، مولوی حجت ملتانی قدیم، مولانا علاؤ الدین لاہوری، ظہیر الدین لنگ، قاضی مغیث الدین بیانہ، ناصر الدین غنی، فخر الدین نقلہ، نظام الدین کلاہی، شمس الدین توم، صدرالدین ناوی، منہاج الدین، صلاح الدین، قاضی محی الدین نمایاں ہیں۔''

علاؤ الدین خلجی کے دربار میں جگت گرو نانک گوپال وارد ہوئے جو اس زمانے میں ہندی موسیقی کے شہنشاہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ دربار میں امیر خسرو بھی تھے۔ اس نے اتنی بے شمار اختراعیں پیش کیں کہ جگت گرو نانک گوپال اس کا شاگرد ہو گیا۔ عبدالمجید سالک (س ن، ص 412) لکھتے ہیں:

''یہ تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ اگر خسرو جیسا طبّاع اور کامل الفن شخص پیدا نہ ہوا ہوتا تو ہندوستانی موسیقی صرف جنگلوں کے جوگیوں ہی کے پاس رہ جاتی اور یہ فن عوام میں تو درکنار سرکاری درباروں میں بھی فروغ نہ پاسکتا۔''

ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں مدرسوں کے قائم کرنے کا عام رواج ہو چکا تھا۔ محمد قاسم فرشتہ (1969، ص 151) لکھتے ہیں:

''چنانچہ سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت میں دہلی علم وتہذیب کا مرکز تھا۔ اس شہر میں ایک ہزار کے قریب مدارس تھے۔ وہ خود عالم اور عالم پرور تھا۔ اسے فارسی، عربی ادب سے لگاؤ تھا وہ ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمران تھا جسے فلسفے سے دل چسپی تھی۔''

فیروز شاہ تغلق نے اپنے دَور حکومت میں کم از کم تیں (30) درسگاہوں کی بنیاد ڈالی۔ ان میں مشہور ترین مدرسہ فیروز شاہی دہلی، مدرسہ ناصر الدین قباچہ (ملتان)، مدرسہ مقبرہ سلطان علاؤ الدین خلجی، مدرسہ بختیار خلجی (بنگال)، مدرسہ محمود گاواں (دکن) مشہور ومعروف درسگاہیں تھیں۔ فیروز شاہ تغلق کے بارے میں ڈاکٹر این۔این۔لاء (1974، ص 85) نے لکھا ہے:

''فیروز شاہ نے رعایا میں جس طرح تعلیم کی ترویج کی کسی اور سلطان نے نہیں کی۔ اس نے مختلف علاقوں میں علماء وفضلا کو آباد کیا تاکہ وہ لوگوں میں دینی تعلیم کی اشاعت کرتے رہیں۔''

سلاطین دہلی کے عہد میں جون پور کے سلاطین شرقی نے علم وادب اور تہذیب وتمدّن کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہیں۔ اس کے بارے میں مولانا ابوالحسنات ندوی (1992، ص46) لکھتے ہیں:

"جون پور مسلمانوں کے علوم وفنون کا مرکز اور علماء کا مرجع تھا۔ جس کو شیرازِ ہند کا خطاب حاصل تھا۔ جہاں بہت سے مدارس قائم تھے۔ تاہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر ہندوستان کا شیراز تھا یا ازمنہ وسطیٰ کا پیرس۔ جون پور کا ہر شہزادہ اس پر فخر کرتا تھا کہ وہ علم وحکمت کا مربی ہے۔"

محمد تغلق کے بعد نہ صرف شمالی ہند میں مختلف صوبے آزاد ہوگئے بلکہ دکن بھی شاہانِ تغلق کے قبضے سے آزاد ہوگیا۔ ظفر خان نے بہمنی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان کے اکثر سلاطین علوم وفنون کی سرپرستی میں مشہور تھے۔ انہوں نے متعدد مدارس قائم کئے۔ محمد شاہ بہمنی دوم، خود صاحبِ علم وفضل تھا اور اس کے عہد میں بہمنی سلطنت میں بہت زیادہ علمی ترقی ہوئی۔ اس کا وزیراعظم محمود گاواں، علمی اشاعت وسرپرستی میں بہت بڑا نام ہے۔ وہ علومِ عقلیہ اور نقلیہ میں دسترس رکھتا تھا۔ اس نے ایک عظیم مدرسہ، احمد آباد بیدر میں تعمیر کروایا جو "مدرسہ محمود گاواں" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مدرسے کے بارے میں عبدالقادر سروری (1934، ص18) لکھتے ہیں:

"یہ مدرسہ، شہر بیدر میں بہ صرف کثیر تیار کیا گیا تھا حادثاتِ زمانہ سے اس کا ایک حصہ خراب ہوگیا ہے لیکن جس قدر عمارت اب بھی باقی رہ گئی ہے۔ اس سے مدرسہ کی قدیم عظمت کا بہت کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ بہت سی درسگاہیں

حکومت کی امداد سے قائم ہوئیں لیکن تعلیمی حیثیت سے
''مدرسہ محمودیہ'' کی سی مرکزیت کسی کو حاصل نہ ہوئی۔''

یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ باقاعدگی اور عمومیت کے ساتھ ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج سکندر لودھی کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ تہذیبی ترقی کے حوالے سے سیّد سلیمان ندوی (1940،ص36) لکھتے ہیں:

''سکندر لودھی نے ہندوؤں کے نہان کی جگہوں میں مساجد، مدرسے اور بازار قائم کیے۔ سپاہیوں کو تعلیم پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی عام طور پر فارسی تعلیم رائج ہوگئی۔''

سکندر لودھی کو مذہبی مباحثوں سے بھی دلچسپی تھی۔ سکندر نے کتب کی فراہمی اور تراجم کے لئے خواص خان نامی ایک امیر کو مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے بعد میاں بدھ نے یہ فرض سنبھالا۔ واقعات ''مشتاقی'' میں ہے کہ میاں بدھ نے اپنے زمانے کے مشہور خوش نویس جمع کیے۔ اور ان کو ہر علم وفن کی کتابیں نقل کرنے پر معمور کیا۔ میاں بدھ خراسان سے کتابیں لایا کرتے تھے۔ خوش نویس کتابوں کی نقل کرنے میں ہمیشہ مشغول رہتے تھے۔ اس نے ہندوستان کے ویدوں اور خراسان کے طبیبوں کو جمع کیا اور ان کی کتابوں کو جمع کیا۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر طب پر کتاب تیار کی جس کا نام ''طب سکندری'' رکھا۔

عہد سلاطین میں دہلی کی مرکزی مسلم سلطنت کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی کئی مسلم خودمختار ریاستیں موجود تھیں۔ تاریخ تعلیم کے حوالے سے ان ریاستوں میں سے بہمنی ریاست بیجا پور، گولکنڈا اور جونپور کی ریاستیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ریاستوں میں علوم وفنون اور تہذیبی نشو ونما خوب ہوئی۔ خصوصی طور پر علم وادب کی ترقی میں ریاست جونپور تھی۔ علم وتہذیب کے

فروغ کے لئے اس چھوٹی سی ریاست نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان کی صدائے بازگشت صدیوں تک سنی جاتی رہی ہے۔ جون پور کے حوالے سے صفدر حیات صفدر اور غلام جیلانی مخدوم (س ن، ص 55) لکھتے ہیں:

> ''جونپور جو مسلمانوں کے علوم وفنون کا مرکز اور علماء کا مرجع تھا۔ جس کو شیراز ہند کا خطاب حاصل تھا۔ جہاں بہت مدارس قائم تھے۔ جس کی اب گزشتہ عظمت کی داستان باقی ہے۔ محمد شاہ کے زمانے تک 60 مشہور مدرسے جون پور میں موجود تھے۔''

تہذیبی حوالے سے مسلمانوں کی طویل حکومت نے ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق (1971، ص 19) لکھتے ہیں:

> ''مذہب ___ ہندوستان تصوّرِ توحید سے نا آشنا تھا۔ یہ مسلمانوں ہی کا فیض تھا کہ متعدد سادھوؤں اور مصلحوں نے توحید کا پرچار شروع کیا۔ زبان ___ ہر زبان (مرہٹی، گجراتی، ہندوی، بنگالی، سندھی) میں الفاظ داخل ہو گئے اور بھاشا اور فارسی کی صورت میں ''اردو'' پیدا ہوئی لباس ___ قبا، کلاہ، عمامہ، دستار، ریشمی رومال، گلوبند، پاجامہ سے متعارف کرایا۔''

خوراک، مکانات، عمارات، روحانیت اور تہذیب کے حوالے سے ڈاکٹر غلام جیلانی برق (1971، ص 20) مزید لکھتے ہیں:

''ہندو خوراک کی لذتوں سے ناآشنا تھے یہ گوشت سے بچتے اور پوری، کچوری، دال کھچڑی ہی پہ گزارہ کرتے تھے، مسلمانوں نے انہیں پلاؤ، بریانی، زردہ، متنجن، شیر مال، کلیجے، باقر خوانی، قورمہ، کوفتے، مرغی، ہرن، تیتر بٹیر کے کباب اور حلوئے کی کئی اقسام سے آشنا کیا۔ مکانات ___ دیوان خانے، غسل خانے باورچی خانے، کتب خانے، برآمدے، کھلے صحن کا اضافہ کیا۔ روحانیت ___ ہمارے صوفیائے کرام کے اثر سے ہندوستان میں بھی روحانیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جس کے عقائد کسی حد تک مسلمان صوفیوں سے ملتے تھے۔''

مغلیہ عہد

ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کی تمام تاریخ میں سلاطین دہلی کے ہاتھوں تعلیم کی کبھی ایسی باقاعدہ سرپرستی نہیں ہوئی، جیسی کہ آلِ تیمور کے زمانہ میں ہوئی۔ جس کا ہر فرد تعلیم کا زبردست علمبردار رہا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا دربار اپنے شباب کے زمانہ میں علماء اور کاملین کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ اپنی روشن خیالی کی وجہ سے تمام کرۂ مشرق میں مشہور رہا ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر جو مغلیہ سلطنت کا بانی ہے۔ خود ایک غیر معمولی علمی قابلیت رکھتا تھا۔ ایک فاضل کی حیثیت سے وہ اپنے زمرے میں کوئی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح بحیثیت شاعر وہ اپنے سلسلہ کے سلاطین میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ وہ جب تک جیا، مختلف قسم کی معرکہ آرائیوں

میں مصروف رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ علم وہنر کی ترویج سے کبھی بیگانہ نہ رہا۔ اس نے جا بجا مدرسے کھولے۔ مسجدیں بنوائیں اور مختلف فلاحی کاموں میں دلچسپی لیتا رہا۔ بابر کی علم وادب سے لگاؤ کے بارے میں جمیل یوسف (1989، ص16) لکھتے ہیں:

> ''ساری زندگی جنگ وعدل میں مصروف رہنے کے باوجود بابر علم وادب کے موتی رولتا رہا۔ تیموری خاندان کا چشم وچراغ ہونے کی وجہ سے اُس کے پیچھے تہذیب وتمدّن کی شاندار روایات تھیں۔''

مغلیہ عہد کے آغاز کے ساتھ ہی ان تمام علمی وتہذیبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگیا۔ جو عہد سلاطین کے مُسلم ہند میں جاری تھیں۔ اسی خاندان کے افراد نے ایک مزید عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی اور ان کے تمدنی کارنامے اس قدر اہم ہیں کہ آج بھی مؤرخین ان کا ذکر فخر آمیز انبساط کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہلاکو خان، چنگیز خان اور امیر تیمور کا خون بابر تک آتے آتے بہت سی خاندانی خصوصیات کو برقرار رکھنے کے باوجود تہذیب شناسی اور علم پروری کے اوصاف پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بابر کی علمی وادبی سرگرمی کے متعلق قاضی جاوید (1995، ص ص 52-51) رقمطراز ہیں:

> ''بابر خود نہ صرف تلوار کا دھنی اور بہت بڑا فاتح تھا بلکہ شاعر، اِنشا پرداز اور ماہر لسانیات بھی تھا۔ ایک دیوان کے علاوہ کم از کم تین کتب اس سے منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک مذہبی اور اخلاقی موضوع پر لکھی جانے والی مثنوی مبین ہے دوسری کتاب کا نام والدیہ ہے جو ایک رسالے کا منظوم ترکی ترجمہ ہے اور تیسری اس کی خودنوشت سوانح عمری تزک بابری ہے۔''

ہمایوں بابر کے بعد تخت نشین ہوا جو کتابوں کا بہت بڑا شائق اور محنتی عالم تھا۔ اکثر فوجی مہمات پر بھی وہ اپنے ساتھ مطالعہ کے لئے کتابوں کی ایک منتخب لائبریری ساتھ لے جایا کرتا تھا۔جس کے متعلق ایس ایم جعفر (1988،ص73) لکھتے ہیں:

''جس وقت وہ ہندوستان چھوڑ کر جا رہا تھا، وہ اپنے ساتھ اپنی پسند کی کتابیں اور اپنے وفادار لائبریرین لالہ بیگ کو بھی جو باڈ بہادر کے نام سے موسوم تھا، لے گیا تھا۔''

چونکہ ہمایوں کو علمِ ہیئت اور جغرافیہ کا بہت شوق تھا۔اس کے عہد حکومت میں ان علوم نے بڑی ترقی کی۔ اس نے کچھ مقالے عناصر کی نوعیت پر لکھے ہمایوں خود عالم وفاضل تھا۔علماء کا قدردان تھا جس کے بارے میں ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن (س ن،ص119) لکھتے ہیں:

''اُس نے اپنے افسروں سے ملنے کے لئے سات ہال بنوائے تھے اور انہیں سات سیاروں کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ان میں سے ایک ہال علماء سے ملنے کے لئے بھی مخصوص تھا۔''

بابر کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملا لیکن جب اس کی اولاد کی علمی وادبی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں تو فطری طور پر حیرت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی اولاد میں سے کامران ترکی اور فارسی کا شاعر تھا۔ ہندال اور عسکری بھی شاعر تھے۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم بھی علم وادب کے حوالے سے نمایاں ہے۔ ہمایوں نامہ اس کی یادگار ہے۔شبلی نعمانی (1955،ص56) رقمطراز ہیں:

''ہمایوں نامہ کے چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ بول چال، طرزِ ادا کی بے ساختگی دل کو

بے اختیار کر دیتی ہے۔''

شیر شاہ سوری نے چار سال تک دہلی پر حکومت کی تھی۔ باوجود قلیل مدت حکومت کے اپنی مملکت میں تعلیم کے لئے بہت کچھ کیا۔ اس نے جتنے تعلیمی ادارے قائم کئے ان میں نارنول (پٹیالہ) کا مدرسہ جو شیر شاہی مدرسہ کے نام سے موسوم تھا سب سے عظیم الشان تھا۔ مدرسہ شیر شاہی کے بارے میں مولانا ابوالحسنات ندوی (1992، ص 32) لکھتے ہیں:

''مدرسہ و مقبرہ کے تعمیری مصارف ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھے، یہ مدرسہ شیر شاہ نے اپنے عہد حکومت سے پہلے دادا کے انتقال کے موقعہ پر بطور کارِ خیر بنوایا تھا۔''

اکبر کا عہد جو تمام ملک میں امن و خوشحالی کے لئے مشہور تھا۔ علمی ترقیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔ اس کا دربار ہمیشہ ایسے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ جنہوں نے مؤرخوں کے دلوں میں مستقل جگہ پائی۔ علامہ ابوالفضل، ابوالفیضی، عبدالقادر بدایونی، خان خاناں عبدالرحیم اور بہت سے علماء اور اہلِ کمال اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ تصنیف و تالیف پر انعامات اور وظائف دیئے جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ''آئین اکبری'' جیسی بلند پایہ تصانیف وجود میں آئیں۔ آگرہ میں متعدد مدارس قائم تھے، یہاں کی تعلیم گاہوں کے لئے شیراز سے علماء بلائے جاتے تھے۔ این۔ این۔ لاء (1916، ص 163) لکھتے ہیں:

''آگرہ، اکبر کے عہد میں علوم و فنون کا ملجا و ماویٰ اور تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اسی شہر میں بہت سے اسکول تھے۔ جہاں طلبہ دُور دُور سے مشہور علماء کے درس میں شرکت کرنے کے لئے آتے اور جن میں شیراز کے ممتاز اساتذہ درس دیا کرتے تھے۔''

اکبر کے نئے بسائے ہوئے شہر فتح پور سیکری میں بھی متعدد مدرسے اور درس گاہیں تھیں۔ مشہور عبادت خانہ، جو اصل میں مذہبی بحث و مباحث کا ایک ہال تھا۔ یہ مختلف اہل فکر اور ممتاز علماء کا مرکز تھا۔ ان علماء نے علم و فن کی ترویج میں جو اہم کردار ادا کیا۔ وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ عہد اکبری کے بارے میں شیخ محمد اکرام (1958، ص 142) لکھتے ہیں:

''اکبر کے عہد میں توران اور ایران سے علمائے عصر کا آنا اور دربار سے وابستہ ہوجانا بھی ایک نیک فال ثابت ہوا، بالخصوص ان علماء کا وَرود، جو عام چلن سے قدرے ہٹ کر سوچتے تھے۔''

ایس ایم جعفر (1987، ص 65) اس دَور کے مدارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اکبر کے دَور میں مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں مدرسے قائم تھے اور دُور دُور سے ان مدرسوں میں اہلِ علم پڑھنے اور پڑھانے آتے تھے۔ جون پور، آگرہ، دہلی، احمد آباد، ملتان اور دوسرے علمی مراکز میں علوم و فنون کی ترویج درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ انھی مرکزوں کے علماء نے اپنی تصنیف و تالیف کے ساتھ ہندوؤں کی بعض کتابوں کے ترجمے کیے۔''

اکبر کے عہد کی تعلیمی ترقی، تغیّرات اور انقلابات کے بارے میں صفدر حیات صفدر اور غلام جیلانی مخدوم (1989، ص 221) لکھتے ہیں:

''اکبر کے دور میں تعلیمی تغیرات وانقلابات پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا تغیر ابتدائی تعلیم میں یہ ہوا کہ مدت تعلیم گھٹ گئی اور جو کام برسوں میں ہوتا تھا مہینوں میں ہونے لگا۔ اس کے نصاب میں وسعت پیدا ہوئی اور بہت سے علوم کا اضافہ کیا گیا۔''

اکبر نے تعلیم میں جو اصلاح کی، اس کی منزل حروف شناسی اور نظم ونثر پڑھنے کی تھی۔ اس کے مدارج یہ تھے (1) حروف تہجی (2) مرکبات (3) نیا خاکہ اور آموختہ اور اس طرح بتدریج آگے بڑھنا (4) نصاب۔ اس حوالے سے ابوالفضل (1975، ص278) رقمطراز ہے:

''اخلاقیات، علم الحساب، بہی کھاتہ، فنِ زراعت، علم الہندسہ، علم المساحت، علم ہیئت، علم رمل، معاشیات، انتظام ملکی، طبعیات، منطق، فلسفہ وحکمت، ریاضیات، الٰہیات اور تاریخ۔''

اکبر کو تاریخ میں اکبر اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور مغلِ اعظم کی حیثیت سے وہ دنیا بھر میں معروف ہے۔ اس مغلِ اعظم کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ بالکل ناخواندہ تھا۔ یہ سب کچھ بجا سہی لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ علم ودانش کے ذوق وشوق میں ہندوستان کا کوئی دوسرا مسلم بادشاہ اس کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس کی علمی مجلسوں میں علم وحکمت کے موتی لٹائے جاتے تھے۔ وہ راتوں کو جاگتا اور کتابیں پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ اس حوالے سے محمد حسین آزاد (1937، ص137) لکھتے ہیں:

''مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو اس کے سامنے نہ پڑھی گئی۔ کوئی تاریخی سرگزشت اکثر فقہی مسائل،

علوم کے عمدہ مباحث، فلسفہ وحکمت کے نکتے ایسے نہ تھے جن
میں وہ خود بحث اور گفتگو نہ کرسکتا ہو۔''

ہندوستان کی ذہنی تربیت میں اکبر کا بڑا حصہ ہے۔اس بارے میں مولانا عبدالمجید سالک (س ن،221) لکھتے ہیں:

''اکبراوراس کے امراء نے جس وسعتِ قلب اور دریا دلی
سے علم وفن اوراس کی تعلیم وتدریس کی خدمت کی، اس کی
مثالیں شاہان سابق میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ قدردانی علماء
وشعراءاورشوق ترویج تعلیم میں عمر بھرمصروف رہا۔ ہندوستان
کی ذہنی تربیت میں اس کا بڑا حصہ ہے۔''

جہانگیر کا عہد بھی علمی لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔وہ خود پڑھا لکھا تھا اور مستند صاحبِ قلم تھا۔ تزک جہانگیری اس امر کا ثبوت ہے۔ جہانگیر کو تعلیم کی ترقی سے اس قدر دلچسپی تھی کہ تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اس نے تمام مکاتب اور مدرسوں کی مرمت اور ازسرنو تعمیر کرائی جو تین دہائیوں سے پرندوں اور جانوروں کا مسکن بنے ہوئے تھے اوران میں اساتذہ اور طلباء کے رہنے کا انتظام کیا۔ معاملات میں تو اکبر پر جہانگیر کو سبقت بھی حاصل تھی۔ جہانگیر کو بے نظیر انشاپرداز تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ رائے مولانا شبلی نعمانی (1992،ص165) نے دی ہے:

''سلسلہ تیموریہ میں یوں تو ہر فرماں روا سخن فہم واداشناس
گزرا ہے، لیکن جہانگیراس فن میں اجتہاد رکھتا تھا۔''

جہانگیر کے بعد شاہجہان مغلیہ خاندان کا سب سے فیاض فرماں روا گزرا ہے۔ وہ خود ایک بڑا مہذب اور صاحبِ ذوق بادشاہ اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا۔ اس کا بڑا لڑکا داراشکوہ ایک بہت

بڑا مصنف تھا۔ حسنات العارفین، مجمع البحرین، نادر النکات، رسالہ حق نما، سفینۃ الاولیاء اس کے سیر حاصل قلم کے نتائج ہیں۔ شاہجہان ایسا فاضل حکمران تھا جو اپنی رعایا کی اخلاقی اور تعلیمی فلاح و بہبود میں دلچسپی رکھتا تھا جس کے متعلق این۔ این۔ لاء (1916، ص 181) نے لکھا ہے:

> ''تمام تعلیمی ادارے جن کے لئے سابق فرماں رواؤں امراء اور دوسرے لوگوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور اوقاف عطا کئے تھے وہ اس کے عہد میں بھی اسی فراغ اور خوشحالی سے چلتے رہے۔''

شاہجہان کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور علماء و طلباء کے وظیفے اور جاگیریں مقرر کر کے ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ کو تعلیم سے معمور کر دیا۔ لاہور میں بادشاہی مسجد اس کی عظیم الشان یادگار ہے۔ مسجد کے شمالی جانب مدرسہ قائم تھا۔ عالمگیری عہد کے علماء کی تصانیف بھی کثیر ہیں لیکن صرف دو معروف کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے اوّل، نجم القرآن، جسے مولانا مصطفیٰ بن سعید نے مرتب کیا یہ ''مضامین قرآن حکیم'' کا اشاریہ یا انڈکس ہے دوسری اہم کتاب، فتاویٰ عالمگیری، ہے جسے حنفی علماء ''ہدایہ'' کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف اپنے فرض میں کبھی کوتاہی نہ کرتا۔ خصوصیت سے وہ گجرات کے بوہروں کی تعلیم کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ جن کے لئے اس نے تربیت یافتہ استاد مقرر کئے۔ علی محمد خان (1925، ص 272) رقمطراز ہیں:

> ''شاہی احکام اس غرض سے بھی بھیجے گئے کہ تین استاد احمد آباد، پٹن اور سورت میں، اور پینتالیس طلباء کا احمد آباد میں اضافہ کیا جائے۔''

اورنگ زیب عالمگیر کو دینی علوم اور فقہ اسلامی سے حد درجہ شغف تھا اس لئے شاہی کتب خانہ میں بہت سی اہم کتابیں دینیات، فقہ اسلامی اور دوسرے علوم پر اس کے حکم سے جمع کی گئیں۔ محمد ساقی مستعد خان (1945، ص 53) لکھتے ہیں:

> ''مشہور ''فتاویٰ عالمگیری'' جو فقہ اسلامی پر ایک بڑی مستند کتاب ہے اور آج مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلہ کے لئے اس کا وجود ناگزیر ہے۔اس شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔''

اورنگ زیب کے عہد میں علمائے فرنگی کو فروغ حاصل ہوا۔ مُلاّ قطب الدین انصاری قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے۔ مُلاّ قطب الدین ایک جھگڑے میں قتل ہو گئے۔ ان کے لڑکوں نے اپنی فریاد بادشاہ تک پہنچائی۔ اورنگ زیب نے لکھنؤ میں فرنگی محل کا علاقہ عطا کر دیا۔ مُلاّ قطب الدین کے فرزند نظام الدین نے بڑا نام پایا۔ جو نظامِ تدریس انہوں نے مرتب کیا۔ اسے ''درسِ نظامیہ'' کہا گیا۔ یہ نصاب، اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے اثرات آج بھی باقی ہیں۔ مُلاّ نظام الدین کی عظمت اور ان کے درس نصاب کی اہمیت کے بارے میں مولانا ابو الحسنات ندوی (1992، ص ص 42-41) لکھتے ہیں:

> ''مُلاّ قطب الدین شہید سہالوی کے نامور فرزند مُلاّ نظام الدین کے فیض نے فرنگی محل کو ہندوستان کا دار العلم والعمل بنایا۔ اسلام میں یہ فخر صرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ تقریباً اڑھائی سو برس تک بلا فصل علماء فضلاء پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی محض علم و فن کی خدمت کے لئے وقف کر دی اور ان کی درسگاہوں سے ہزاروں علماء نکل

کر ملک کے ہر گوشے میں پھیل گئے۔''

مدرسہ عالیہ نظامیہ لکھنؤ کو برصغیر کی عظیم اور قدیم درسگاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مدرسے کی عظمت کی بڑی وجہ، اس کا نصاب ہے۔ جو مُلاّ نظام الدین نے خود مُدوّن کیا ہے۔ نصاب کے بارے میں پروفیسر امیر الاسلام (1975، ص 11) لکھتے ہیں:

> ''مدرسہ عالیہ نظامیہ کے نصاب میں صرف ونحو، معنی و بیان معانی، عروض، منطق، علمِ کلام، سیرت، تاریخ، طب، ہیئت، ہندسہ، مناظرہ، فقہ، اصولِ فقہ، فرائض، حدیث، اصولِ حدیث، تفسیر اور اصولِ تفسیر کی 79 کتابیں شامل ہیں۔ یہ وہ نصاب ہے جو پاک و ہند کی تقریباً ہر اسلامی درسگاہ میں رائج ہے۔''

اورنگ زیب کے عہد میں ایک اور عظیم مدرسہ قائم ہوا۔ جسے بلا مبالغہ ایک عہد ساز مدرسہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ مدرسہ ''رحیمیہ دہلی'' تھا۔ جسے شاہ ولی اللہ کے والد بزگوار شاہ عبدالرحیم نے قائم کیا۔ خود شاہ ولی اللہ اپنے عہد کے متبحر عالم تھے۔ انہوں نے علمی موضوع پر بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا۔ مدرسہ رحیمیہ کی عظمت کو مولانا ابو الحسنات ندوی (1992، ص 94) اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''یہ مدرسہ صرف درس گاہ نہیں تھا بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ تھا۔ اسے ایک خانقاہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ یہاں کردار بنائے جاتے تھے۔ اور مجاہدین کی تربیت کی جاتی تھی۔ اسے ایک اکادمی کہنا بھی بے جانہ ہوگا۔''

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اسلام نے اطراف ہند میں تعلیمی اور دینی، بکثرت مدارس قائم کئے تھے۔ لیکن یہ پتہ لگانا سخت مشکل ہے کہ یہ مدارس کن کن شہروں اور کن قصبوں میں قائم کئے تھے۔ البتہ خاص خاص شہروں اور قصبوں کے چند منتخب مدارس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

دہلی کے مدارس میں، مدرسہ معزی، مدرسہ ناصریہ، مدرسہ مقبرہ علائی، مدرسہ قلعہ خرم آباد، مدرسہ حوض خاص، مدرسہ فیروز شاہی، مدرسہ بالا بند آب سیری، مدرسہ مقبرہ فتح خان، مدرسہ ہمایونی، مدرسہ مقبرہ ہمایوں، مدرسہ خیر المنازل، مدرسہ دار البقا، مدرسہ اجمیری دروازہ، مدرسہ ارادت خان، مدرسہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب۔

پنجاب کے مدارس میں، مدرسہ مسجد وزیر خان (لاہور) مدرسہ سیالکوٹ، مدرسہ درگاہ شیخ چلی (تھانیسر) پٹیالہ/ نارنول میں مدرسہ نارنول شیر شاہ سوری، آگرہ کے مدارس میں مدرسہ محلّہ، مدرسہ زین الدین، مدرسہ خس، مدرسہ مسجد شاہی، مدرسہ بیانہ۔

فتح پور سیکری کے مدارس میں، مدرسہ شاہی، مدرسہ شیخ ابوالفضل، بدایوں میں مدرسہ معزی متصل جامع مسجد، دارانگر میں مدرسہ دارانگر، مضافات امروہہ، روہیل کھنڈ میں مدرسہ شاہجہانپور، مدرسہ بریلی، مدرسہ پیلی بھیت، اودھ میں مدرسہ سہالی، مدرسہ شاہ پیر محمد لکھنؤ، مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ، الہ آباد میں مدرسہ دائرہ شاہ افضل، فرخ آباد میں مدرسہ فخر المرابع، مدرسہ حسن رضا خان، مدرسہ چھاؤنی، جون پور میں مدرسہ بی بی راجہ بیگم، مدرسہ اٹالہ کی مسجد، بنارس میں مدرسہ بنارس وغازی پور، بہار میں مدرسہ سہسرام، مدرسہ داناپور، مدرسہ خانقاہ پھلواری، مدرسہ پٹنہ، بنگال کے مدارس میں مدراس رنگ پور (ندیا)، مدرسہ لکھنوتی، درسباڑہ (عمرپور)، مدرسہ تیلہ (استھی پور)، مدرسہ گور، مدرسہ شائستہ خان (ڈھاکہ)، مدرسہ مسجد خان محمد میروہ (ڈھاکہ)، مدرسہ محلّہ اعظم پورہ (ڈھاکہ)، مدرسہ کٹرہ (مرشد آباد)، مدارس سیلہ پور، مدرسہ بوہار (علاقہ بردوان)۔

دکن کے مدارس میں، مدرسہ بدر، مدرسہ گلبرگہ، مدرسہ گولکنڈا (چہار مینار)، مدرسہ آثار شریف، مدرسہ اثنا عشری (احمد نگر)، مدرسہ بغداد (احمد نگر)، مدرسہ خاندیس، مدرسہ دولت آباد، مدرسہ والا جاہ (مدارس)۔

مالوہ کے مدارس میں، مدارس اطراف چتور، مدرسہ شادی آباد (سندھ) مدرسہ سارنگ پوری، مدرسہ ظفرآباد نعلچہ، مدرسہ اجین۔

ملتان واُچہؔ میں، مدرسہ فیروزی (اُچہؔ) مدرسہ ملتان، مدارس حسین شاہ۔

کشمیر میں مدارس سلطان سکندر، مدرسہ حسین چک شاہ، مدرسہ حسین خان والی، گجرات کے مدارس میں مدرسہ سیف خان (احمد آباد) مدرسہ شیخ الاسلام (احمد آباد) مدرسہ احمد کھنو، مدرسہ مقبرہ حسّام الدین (نہروالہ)، مدرسہ تالاب خان سرور (نہروالا) مدرسہ عثمان پور۔

سورت میں، مدرسہ مقبرہ سیّد محمد بن عبداللہ العبدروس، مدرسہ مسجد مرجان شامی، مدارس احمد آباد، سورت، پٹن۔

نصاب

مدارس ومکاتب سے زیادہ طریقہ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی تاریخ تاریکی میں ہے البتہ بڑی جستجو سے قدیم نصاب سے متعلق مولانا ابوالحسنات ندوی (1992، ص ص98-97) تحریر کرتے ہیں:

> ''مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سہولت کے لحاظ سے نصاب درس کے چار دَور قائم کریں اور جو کتابیں ہر دَور میں مروج تھیں ان کی تفصیل جہاں تک تاریخ سے، سیرت مشائخ کے طبقات سے، شُعراء کے تذکروں سے اور مکتوبات وملفوظات

سے مل سکتی ہے یکجا کردیں۔''

دَوراوّل

اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جبکہ دوسرا دَور شروع ہوگیا تھا۔کم وبیش دوسو برس تک ان فنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی۔صرف،نحو، بلاغت،فقہ،اصولِ فقہ،منطق،کلام،تصوف،تفسیر،حدیث۔

علم نحو: مصباح،کافیہ،لب الالباب،مصنفہ قاضی ناصرالدین بیضاوی،اور کچھ دنوں بعدارشاد،مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی۔

فقہ: ہدایہ۔

اصول فقہ: مناد،اوراس کے شروح اور اصولِ بزددی۔

تفسیر: مدارک،بیضاوی،اور کشاف۔

تصوف: عوارف،فصوص الحکم اورایک زمانہ کے بعد نقد النصوص ولمعات بھی ان مدارس میں رائج ہوگئی تھیں جو خانقاہوں سے متعلق تھے۔

حدیث: مشارق الانوار،مصابیح اُلسنہّ یعنی مشکوٰۃ المصابیح کا متن۔

ادب: مقامات حریری،زبانی یاد کی جاتی تھی۔

منطق: شرح شمسیہ۔

فن کلام: شرح صحائف اور بعض بعض مقامات پر تمہیہ ابوشکور سالمی۔

دَور دوم

یہاں پر دَور دوم کے داخل نصاب کتابوں کے نام بنام فہرست دینا محض طوالت ہے۔ کیونکہ دَور اوّل کی جن کتابوں کی فہرست دی چکی ہے مذکورہ بالا کتابیں یعنی مطالعے و مواقف اور ان کی شرحیں مطول، مختصر، تلویح، شرح، عقائد نسفی، شرح وقایہ اور شرح جامی اس فہرست پر اضافہ کر لینے سے دَور دوم کا نصاب مقرر ہو جاتا ہے۔

دَور سوم

دَور دوم میں جو تغیر نصاب درس میں ہوا اس سے لوگوں کی اُمنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیار فضیلت کو پہلے سے بھی زیادہ بلند کرنے کے متمنی تھے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی ہندوستان آئے۔ ادھر دربار اکبری نے ان کو عضد الملک کا خطاب دیکر بہت بلند پایہ بنا دیا۔ انہوں نے سابق درس میں کچھ جدید اضافے کئے۔ جس کو علماء نے فوراً قبول کر لیا اور اب مدارس میں نئی قسم کی چھل پہل نظر آنے لگی، مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد نے اس کا اعتراف کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے جو اس دَور کے سب سے اخیر مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے۔ الجزاء اللطیف میں اپنی درسیات کو اس ترتیب سے لکھا ہے:

نحو: کافیہ شرح جامی۔

منطق: شرح شمسیہ، شرح مطالعہ۔

فلسفہ: شرح ہدایۃ الحکمۃ۔

کلام: شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی، شرح مواقف۔

فقہ: شرح وقایہ، ہدایہ کامل۔

اصول فقہ: حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح۔

بلاغت: مختصر و مطول۔

ہئیت وحساب: بعض رسائل مختصرہ۔

طب: موجز القانون۔

حدیث: مشکوٰۃ المصابیح کل۔شمائل ترمذی کل، کسی قدر صحیح بخاری۔

تفسیر: مدارک بیضاوی۔

تصوف وسلوک: عوارف ورسائل نقشبندیہ، شرح رُباعیات جامی مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد الفصوص۔

دَور چہارم

چوتھا دَور بارہویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اسکے بانی مُلّا نظام الدین تھے۔ جنہوں نے اس کی بنیاد ایسے زبردست ہاتھوں سے رکھی کہ باوجود امتدادِ زمانہ آج تک اس میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی۔ مُلا نظام الدین نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا اور بعد اضافہ اس نصاب کی مکمل صورت یہ ہوئی۔

صرف: میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔

نحو: نحو میر، شرح مأتہ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر سلم العلوم۔

حکمت: میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔

ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالہ اوّل، تشریح الافلاک، رسالہ، توشجیہ شرح چغمینی۔

بلاغت: مختصر المعانی، مطول تا ما انا قلت

فقہ: شرح وقایہ اوّلین، ہدایہ آخرین۔

اصول فقہ: نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت۔

کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔

تفسیر: جلالین، بیضاوی۔

حدیث: مشکوٰۃ المصابیح۔

معاشرت

عہد مغلیہ کا معاشرہ اگر چہ جاگیرداری طرز کا تھا۔ مگر اعلیٰ پیمانے پر ثقافت پرور اور ترقی پذیر تھا۔ علوم وفنون کی سرپرستی، ذوقِ سلیم کی حوصلہ افزائی، روشن خیالی اور شوکت ونمود کی قدر شناسی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مغل بادشاہوں کے دربار اور محلّات، تہذیب وشائستگی کے گہوارے تھے۔ معاشرہ اعلیٰ جمالیاتی ذوق اور بہترین صلاحیت وتہذیب سے آراستہ اشخاص سے مزّین

رہتا۔ معاشرہ چار طبقوں میں منقسم تھا۔ بادشاہ، امراء، متوسط طبقہ اور عوام ۔ مسلم امراء میں تہذیب وآداب کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ مسلمان دس کروڑ کی آبادی میں سے صرف ڈیڑھ کروڑ تھے۔ گویا اقلیت میں تھے۔ زیادہ آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مغل بادشاہوں نے قابلِ ہنر افراد کی سرپرستی کی اور انہیں امراء کا درجہ دیا۔ ہندو معاشرہ میں روشن خیالی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندوؤں کے ساتھ مجلسی اور ثقافتی روابط قائم کر کے اِن سے تہذیبی اور تمدّنی مفاہمت کا ماحول بھی استوار کیا۔ اس روشن خیالی کے متعلق محمد عبداللہ ملک (1980،ص 647) لکھتے ہیں:

> ''مغل بادشاہوں نے رسم ستی کی روک تھام، بچہ کشی کی ممانعت اور اوہام پرستانہ رسومات کی تنسیخ سے ہندو معاشرہ میں روشن خیالی پیدا کرنے کی کوشش کی۔''

لباس

معاشرت واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم تھی ۔ مسلم معاشرہ اور ہندو معاشرہ۔ برصغیر کے بعض مقامات پر بدھ، جین، پارسی، اور عیسائی بھی آباد تھے لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ معاشرت واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم تھی ۔ مسلم معاشرہ اور ہندو معاشرہ لباس کے متعلق سیّد عبدالقادر اور محمد شجاع الدین (1956،ص 85) لکھتے ہیں:

> ''مسلمان لباس میں بالعموم شلوار قمیض اور دستار استعمال کرتے تھے۔ داڑھی رکھتے تھے امراء بیش قیمت قبا اور اس پر لمبا چست چغہ پہنتے تھے۔ ہندو مرد دھوتی، قمیض اور پگڑی پہنتے تھے۔ ہندو عورتیں ساڑھی باندھتی تھی۔ مرد اور عورتیں دونوں

زیورات پہنتے تھے۔''

تقریبات اور تہوار

مغل تعصّب سے یکسر بیگانہ اور رواداری کے علمبردار تھے۔غیر مسلموں کو اپنی مہذہبی روایات کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی تھی۔اس کے باوجود تفریحات اور تہواروں کے سلسلے میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں واضح اختلاف تھا۔مغلیہ دَور کی تقریبات وتہواروں کے بارے میں ایس ایم جعفر (1988،ص215) رقمطراز ہیں:

''مسلمان عسکری کھیلوں، گھڑسواری، شکار، پولو، کشتی، کبڈی وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ہندو شطرنج اور قمار بازی کے رسیا ہوتے تھے۔مسلمانوں میں سماجی تہوار نہیں تھے البتہ مذہبی تہوار مثلاً جمعہ اور عیدین، شبِ برات کا تہوار منایا جاتا تھا۔ ہندوؤں کا معاشرہ تہواروں کو اہمیت دیتا تھا۔انکے اہم تہوار بسنت، ہولی، دیوالی اور شیوراتری تھے۔''

عورت کا مقام

مغل دَور میں عورت کا مقام اور حیثیت پہلے کی نسبت بہتر ہوگئی تھی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم، جائیداد اور سیاسی امور میں خدمات انجام دینے کی آزادی اور مواقع بھی حاصل ہو گئے تھے۔ عورت کے مقام کے سلسلے میں محمد عبداللہ ملک (1980،ص166) لکھتے ہیں:

''عورتوں کا اِتنا احترام کیا جاتا ہے کہ عام آدمی اور سپاہی بھی قتل وغارت کے ہنگاموں میں کوئی تکلیف نہیں دیتے فتح

منڈی کے نشاط پرور ہنگاموں میں بھی حرم کا تقدّس ملحوظ رکھا جاتا ہے۔''

فنونِ لطیفہ

مغلوں کے وَرود کے بعد ہندوستان میں ہر تہذیبی و ثقافتی سرگرمی نے ایک بالکل نیا رنگ اختیار کیا اور وسط ایشیا کے ان مہذّب اور ترقّی یافتہ لوگوں نے باغات کی ترتیب وتہذیب میں بھی انقلابی تبدیلیاں کر دیں۔ انہوں نے باغات کے پرانے خاکے کو بدل کر درختوں، پھلواریوں، فواروں آبشاروں اور آرائش کے ساتھ مرتب کیا۔ جن کی سیر سے شعر وادب، مصوری، موسیقی، روحانیت اور خداشناسی کے میلانات کو تقویت پہنچتی تھی۔ گویا ان باغوں کی افادیت کتب خانوں اور مدرسوں سے ہرگز کم نہ تھی۔ ان کے بارے میں عبدالمجید سالک (س ن، ص 354) لکھتے ہیں:

> ''باغوں کی ترتیب وتہذیب سے ثبوت ملتا ہے کہ وہ اس ملک کے لوگوں کو حسنِ مذاق کی نعمت سے مالا مال کرنا چاہتے تھے۔ جو ہر تہذیب وترقی کی شرط اولین ہے۔ باغوں کے نام یوں گنوائے ہیں: نسیم باغ، نگین باغ، شالا مار باغ کشمیر، نشاط باغ۔ ہبک باغ، دارشکور باغ، داروغہ باغ، چشمہ شاہی باغ، ویری ناگ باغ، اچھابل باغ، پری محل باغ، لاہور کا شالا مار باغ۔''

فنِ تعمیر

اسلامی ہندوستان کا فنِ تعمیر مغلوں کے عہد میں کمال کو پہنچا۔ مغل ایرانی فنون کے وارث تھے۔ بابر کو بڑی عمارتیں بنانے کی مہلت نہیں ملی۔ لیکن تعمیر میں اس کی معروفیت تزک بابری سے

ظاہر ہے وہ لکھتا ہے کہ صرف آگرہ، سیکری۔ بیانہ دھول پور۔ گوالیار اور کول میں روزانہ 1491 سنگتراش میرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ہمایوں نے بھی اپنی حکومت کے ابتدائی دس سال پایہ تخت میں عمارتیں بنانے پر صرف کئے۔ جن میں ایک ہفت ایوان محل بھی تھا۔ جس میں سات ایوان سات ستاروں سے منسوب کئے تھے۔ تعمیر کا مغل دبستان حقیقت میں اکبر سے شروع ہوا۔ جس نے ایک نئے فن کی بنیاد رکھی۔ پہلی تعمیر ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ اسی زمانے میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا روضہ گوالیار میں تعمیر ہوا۔ یہ مرمر کی جالیوں اور نقاشی کے کمالات سے مزّین ہے۔ اکبر کی عمارتوں میں قلعہ آگرہ کا پرانا محل بھی قابل ذکر ہے۔ اس کو لال محل بھی کہتے ہیں۔ یہ تمام تر سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ گو یہ جہانگیری محل کہلاتا ہے لیکن اس کی تعمیر اکبر کے زمانے میں شروع ہوگئی تھی۔ یہ محل 249 فٹ لمبا اور 260 فٹ چوڑا ہے۔ فتح پور سیکری اکبر کی تعمیری مصروفیتوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کو اکبری شہر کہا جاسکتا ہے۔ یہاں سب سے پہلے ''محل خاص'' تعمیر ہوا۔ جو آگرہ کے لال محل سے بہت بڑا ہے۔ فتح پور سیکری کی مسجد ہندوستان بھر میں بے نظیر مسجد سمجھی جاتی ہے۔ طول 544 فٹ عرض 474 فٹ۔ مسجد کا جنوبی دروازہ ''بلند دروازہ'' کہلاتا ہے۔ اس قدر عظیم اور مرعوب کن ہے کہ دنیا کی کسی مسجد کا دروازہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

جہانگیر نے اپنے باپ دادا کے مقابلے میں کم عمارتیں بنوائیں۔ سری نگر کے قریب شالامار باغ تعمیر کیا۔ لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی اُسی زمانے کا ہے۔

شاہجہان کا شوقِ تعمیر حیرت انگیز ہے کہ اس کے عہد میں مغل اسلوب تعمیر میں نمایاں انقلاب آگیا۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد دنیا بھر کے شاہی محلوں میں نظیر نہیں رکھتا۔ علامہ اقبال نے جامع مسجد کے متعلق کہا تھا کہ یہ عمارتوں میں ''بیگم'' معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ان کا مقصد اس کی نفاست اور بانکپن کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح تاج محل عمارت دنیا بھر کے تعمیری عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر اپنی مذہبیت کی وجہ سے تعمیرات میں اسراف کا قائل نہ تھا۔ پھر بھی لال قلعہ (دہلی) میں کچھ اضافے کئے۔ جن میں چھوٹی سی موتی مسجد شامل ہے۔ بہر حال ''چوبی تعمیر'' اور چتر کاری سے کاریگروں کی صناعی کا پتہ چلتا ہے اور یہ عدیم المثال ہیں۔

مصوّری

بابر تزک بابری میں جہاں جہاں باغوں، کوہساروں، سبزہ زاروں کا حال بیان کرتا ہے وہاں اس کا قلم بلاشبہ مّصوری کے پھول بکھیرتا ہے۔ اس کی اس نثر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ نقش وتصویر کے معاملے میں کس قدر باریک بین جمالیاتی نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے تیموری آباؤ اجداد کے کتب خانے سے فنِ مصوری کے بہترین شاہکار فراہم کئے اور ہندوستان لے آیا۔ ان شاہکاروں نے ہندوستان کے فن تعمیر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اکبر کے دور میں مغل دبستان مصوری وجود میں آیا۔ مصور اور خطاط دونوں پہلو نظر آتے ہیں اکبر نے اپنے کارخانہ جات شاہی میں ایک خاص شعبے کا اضافہ کیا جس میں کتاب سازی کے تمام متعلقہ فنون مثلاً مّصوری، خطاطی، نقاشی، جلد بندی اور آرائش وزیبائش کے کام سکھائے جاتے تھے۔ جہانگیر کو مصوری اور مصورین کے نقطہءِ نظر میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ چنانچہ تزکِ جہانگیری کے حوالے سے عبدالمجید سالک (س ن، ص394) لکھتے ہیں:

> ''اب فنِ مصوری سے میرے لگاؤ اور شناخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی تصویر میرے سامنے لائی جائے خواہ وہ کسی متوفی مصور کی ہو یا زندہ کی اور مجھے اس کا نام نہ بتایا جائے تو میں ایک لمحے میں بتادوں گا کہ یہ فلاں مصور کے موقلم سے ہے۔ اور یہ ہر شبیہ کا چہرہ الگ الگ مصوروں نے کھینچا ہو۔ تو میں بتا

سکتا ہوں کہ کون سا چہرہ کس مصوّر نے کھینچا ہے۔''

خطّاطی

جس طرح فنِ مصوری کی تجدید و ترویج کا سہرا مغلوں کے سر ہے۔ اور خوشنویسی کو رواج دینے اور کمال کو پہنچانے کے ذمہ دار بھی مغل ہیں۔ بابر کی خطاطی سے دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے جمیل یوسف (1989، ص16) لکھتے ہیں:

''بابر خود خطاطی کا بڑا قدر دان تھا۔ بلکہ خود بھی اس فن میں مہارت رکھتا تھا اور ایک خاص نئے خط کا موجد بھی تھا۔ جس کو ''خط بابری'' کہتے ہیں۔ بابر نے اسی خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظّمہ بھیجا تھا۔''

مغل بادشاہوں کی تہذیبی خدمات کے سلسلے میں خطاطی کے حوالے عبد المجید سالک (س ن، ص732) لکھتے ہیں:

''اکبر نے نستعلیق کے ساتھ ساتھ مختلف اسالیب خط کی سرپرستی بھی کی اور آرائشی خطوط میں سے ثلث، توقیع، محقق، ریحان، نسخ، رقاع، غبار، طغرا اور کوفی کے باکمال لوگوں کو جمع کیا۔''

غرض خوش نویسی و خطاطی اور نقاشی کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں ثقافت و تہذیب کی جو کچھ خدمت ہوئی، وہ مغلوں کی مرہونِ منت ہے۔ جہانگیر اور اورنگ زیب کے متعلق ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی (1976، ص180) لکھتے ہیں:

''جہانگیر بھی خطاطی کی سرپرستی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد

میں میر عبداللہ تبریزی ایک باکمال خوش نویس تھا۔ جسے اکبر
نے ''مشکین رقم'' کا خطاب دیا تھا۔ اورنگ زیب کو خود نسخ
اور نستعلیق دونوں میں دستگاہ حاصل تھی۔''

اورنگزیب کے عہد میں پنڈت لکشمی رام، لالہ سکھر رام، منشی محبوب رائے اور کسل رائے مشہور ہندو خوش نویس تھے۔ غرض خوشنویسی وخطاطی اور نقاشی کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں ثقافت وتہذیب کی جو کچھ خدمت ہوئی ہے وہ تمام تر مسلمانوں ہی کی کوشش ومحنت کی شرمندۂ احسان ہے۔

موسیقی

فنِ موسیقی کو شاہانِ مغل کے زمانوں میں جو فروغ ہوا۔ اس کے تذکرے اور تعریف میں سب مؤرخین رطب اللّسان ہیں۔ بابر کا زیادہ وقت قسمت کے نشیب وفراز میں گزرا۔ لیکن اسے بھی نغمہ وسرور سے بے حد شغف تھا۔ توزک بابری میں جابجا اپنی مجالس موسیقی اور گانے والوں کا ذکر کرتا ہے۔ ہمایوں بھی ماہرین موسیقی کا مرتبہ دان تھا۔ اس نے اپنے مُقربین کے تین طبقے تجویز کئے تھے۔ ''اہل سعادت'' میں علما ومشائخ اور ماہرین علوم ''اہل دولت'' میں امراء شہزادگان اور ''اہل مراد'' میں شاعر اور موسیقار شامل تھے۔ مختلف موسیقار کے امتزاج سے خاص قسم کی موسیقی پیدا ہوئی۔ جس کا اظہار صفدر حیات صفدر (س ن، ص 166) اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''ایرانی، عربی وہندی موسیقی کے امتزاج سے شمالی ہند میں
ایک خاص قسم کی موسیقی پیدا ہوئی، اور یہ امتزاج مغلوں کے
عہد میں انتہا کو پہنچ گیا۔''

اکبر کا عہد فنون لطیفہ کے حق میں ایک زرّیں عہد تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کو فنِ موسیقی

سے بے حد شغف تھا۔ اپنے دربار میں بڑے بڑے باکمال موسیقاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ ان میں ہندو، مسلمان، ایرانی، تورانی، کشمیری زن و مرد سب پائے جاتے ہیں۔ میاں تان سین گوالیاری دربار اکبری کا سب سے بڑا گویّا تھا۔ جس کے متعلق ابوالفضل (1975، ص35) کی رائے یہ ہے:

''گزشتہ ایک ہزار سال سے ہندوستان میں ایسا باکمال گویّا پیدا نہیں ہوا۔''

محمد شاہ کے زمانے میں فنِ موسیقی کی مقبولیت اور شاہی قدردانی کمال کو پہنچ گئی تھی۔ موسیقی کے جتنے ساز ہندوستان میں مقبول ہوئے۔ ان میں کثرت ان سازوں کی ہے جن کو یا تو مسلمان باہر سے اپنے ساتھ لائے یا جن کی اختراع انہوں نے بعد میں کی۔ عرب ایرانی ساز، ربابؔ، چنگؔ غجکؔ، طنبورہؔ، شہرودؔ، قانونؔ، عودؔ نے دفؔ، نقارہؔ، شہنائیؔ، بربطؔ وغیرہ تھے۔ ستارؔ، جل ترنگؔ، طاؤسؔ، دلرباؔ، طبلہ یہاں کے مسلمانوں نے اختراع کئے۔ محمد شاہ رنگیلا کے دربار کے ایک مغنی سارنگ نے سارنگی ایجاد کی۔ جس نے تمام سازوں کو پرے بٹھا دیا۔ اور ایسا رسوخ حاصل کیا کہ آج تک سارنگی اور طبلے کے بغیر موسیقی کی کسی دلکش محفل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ محمد شاہ کی موسیقی سے وابستگی سے متعلق محمد ساقی مستعد خان (1945، ص183) رقمطراز ہیں:

''شاہی سرپرستی کے ختم ہونے کے باوجود موسیقی ترقی پذیر رہی اور اب شہزادوں اور اُمراء کے علاوہ عوام بھی اُسکے مربّی بن گئے۔ اورنگزیب کے جانشین باقاعدہ طور پر موسیقی کی قدر کرتے رہے۔ تختِ طاؤس کے آخری وارث محمد شاہ رنگیلا موسیقی کی سرپرستی کرنے میں سب سے سبقت لے گیا۔''

اقتصادی حالت

اقتصادی لحاظ سے برصغیر پاک وہند اتنا خوشحال کبھی نہ ہوا تھا جتنا مغلوں کے دور میں تھا۔ بقول ولیم ہاکنز برصغیر سونے اور چاندی سے بھرپور ہے۔ برصغیر کی خوشحالی اس کی تین چیزوں کی آئینہ دار تھی پیداوار کی فراوانی، اشیاء کی ارزانی، تجارت اور صنعت وحرفت کی ترقی، پیداوار کی فراوانی کی وجہ سے دنیا بھر میں برصغیر پاک وہند ''سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور تھا۔'' غیر ملکی سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں اسکی غذائی اجناس کی افراط اور مصنوعات کی بے انتہا فراوانی کا ذکر کیا ہے۔ مغلیہ دور کی اقتصادی حالت کے متعلق گلبدن بیگم (1966،ص 131) لکھتی ہیں:

> ''دَورِ مغلیہ میں اقتصادی حالت اچھی خاصی تھی۔ ارزانی عام
> تھی اور چیزوں کے حصول میں کوئی دِقّت نہ ہوتی تھی۔''

برطانوی عہد

برطانوی عہد میں جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے لئے صورت حال مزید ابتر ہوگئی مسلمان تعلیمی، معاشی، اور معاشرتی لحاظ سے تباہی کے آخری کنارے پر پہنچ گئے مسلمانوں نے ہلِ بصیرت افراد نے اُٹھنے والے خطرے کی بوسونگھ لی تھی۔ ان میں سے ایک طبقے کی رائے تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی علوم حاصل کر کے معاشرے میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم حکمرانوں کی زبان سیکھ کر ان کے ساتھ انہی کی زبان میں گفتگو کر کے اپنے حقوق حاصل کریں لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ قدیم اسلامی روایات اور علمی سرمائے کی حفاظت کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس طبقے کا خیال تھا کہ ہم مغربی علوم حاصل کر کے اپنے علمی سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور عیسائی مبلغوں اور اسلام کی مخالفت میں کام کرنے

والوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے مزید یہ کہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا تہذیب وتمدّن بھی آئے گا جو مسلمانوں کو اسلام سے دُور لے جائیگا۔ دونوں مکاتبِ فکر میں ایک بات مشترک تھی کہ یہ دونوں طبقے برصغیر میں مسلمانوں کے عُروج اور ترقی کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ منزل ایک تھی لیکن راستے الگ تھے۔

یہ دو مکتب فکر علی گڑھ اور دیوبند کے نام سے موسوم ہوئے ایک نے مسلمانوں کی حالت سنوارے، عیسائی مشنریوں کے اسلام پر اعتراضات کے تحقیقی اور علمی جوابات دیئے، انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ آزادی کی وجہ سے پیدا ہونے والی بداعتمادی کی فضا ختم کرنے اور مُلکی نظم ونسق میں حصہ دار بننے کے لئے مغربی علوم کا سہارا لیا۔ جبکہ دوسرا طبقہ ہر قسم کی سیاسی مشکلات کے باوجود انگریزوں سے تعاون کا روادار نہ تھا۔ انہوں نے خالص دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو اپنا قومی شناخت برقرار رکھنے کی راہ پر ڈالا۔ مسلمان رہنماؤں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان دونوں تعلیمی کوششوں کو انتہا پسند خیال کرتے ہوئے اعتدال چاہتے تھے۔ ان کی کاوش سے برصغیر پاک وہند میں سیاسی اور تعلیمی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ برصغیر میں انگریزی تعلیم کے اثرات کو ختم کرنے میں دینی اداروں کے تہذیبی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے منظور احمد جاوید (1979، ص75) رقمطراز ہیں:

> ''یہی وہ ٹمٹماتے چراغ ہیں جنہوں نے اسلامی اقدار اور دینی علوم کی حفاظت وترویج کی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو بدیشی حکمران پورے ہندوستان کو حلقہ بدوشِ عیسائیت کر چکے ہوتے۔ انہی مدارس کی وجہ سے اسلام کا نام زندہ ہے۔''

مسلمانوں کی ثقافت کی بنیادیں اسلام کی مستقل تہذیبی واخلاقی اقدار پر استوار ہوتی ہیں۔ جب تک معاشرہ ان اقدار کا پابند رہتا ہے ثقافت پھولتی پھلتی رہتی ہے اور اس کے عقلی اور

حیاتی پہلو سکون و جمود کا شکار نہیں ہونے پاتے لیکن جب قدروں کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے تو پورا نظامِ معاشرت متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اخلاق، اقتصاد، ادب، ذہنی نشو ونما اور روحانی ارتقاء کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگتی ہے۔ یاس اور ناامیدی کے اس عالم میں یکا یک کسی گوشے سے ایک نئی آواز بلند ہوتی ہے۔ جس کا نغمہ ملت کے بہی خواہوں کے لئے بہشتِ گوش بن جاتا ہے۔ دینی، اخلاقی، ذہنی، تہذیبی اقدار از سرِ نو زندہ ہو جاتی ہیں۔ نئی آواز چوں کہ نئے تقاضوں اور نئے ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے سب اس کی دل کشی اور افادیت سے مسحور ہو جاتے ہیں اور قلوب و اذہانِ انسانی میں دین پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم کی خصوصیات میں اسلامی ثقافت کے ایک عنصر ''رواداری'' پر وفیسر سیّد محمد سلیم (1989، ص 21) نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ''مسلمان عوام اور حکمرانوں کا رویّہ غیر مسلموں کے ساتھ عموماً رحم دلی اور فراخ دلی کا رہا ہے۔ محض غیر مسلم رعایا ہونیکی بنا پر کبھی انہوں نے حقارت اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا غیر مسلم رعایا کی جان و مال، عزت آبرو، مذہب اور رسومات مسلمان حکمرانوں کے دَور میں محفوظ تھیں۔ اقلیتوں کو فنا کر دینے یا کثرت میں مدغم کر دینے یا تہذیبی خصوصیات سے ان کو معریٰ کر دینے کے شیطانی خیالات کبھی کسی مسلمان حکمران کے دماغ میں نہیں آئے۔''

وہ تمام سرگرمیاں جو کسی معاشرے میں کسی بھی صورت میں انجام دی جا رہی ہوں تو وہ اس معاشرے کی تہذیب کے زمرے میں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً گیت، قومی اور علاقائی شاعری، لوک رقص، لوک موسیقی، داستانیں، شادی بیاہ کی رسمیں، موت مرگ کے طریقے، ہمارے زرعی آلات

اور کاشتکاری کے طریقے ، لباس ، اس کی تراش خراش ، طرزِ تعمیر اور طرز رہائش ہمارا علمی وادبی سرمایہ اور اس کی تخلیق سے متعلق ہمارے فکری رویّے اور سوچیں ، ہماری عادات ، خصائل ، اسلامی روایات ، ہماری دیسی طرز کی مصنوعات جن میں دستکاریاں وغیرہ شامل ہیں ۔ آدابِ محفل یا نشست و برخاست کے آداب یعنی سماجی محفلیں ، مذہبی رسومات اور تہوار مقامی اور علاقائی میلے ٹھیلے ، اوطاق ، چوپال اور بیٹھک اسلامی تہذیب کا حصہ ہیں ۔ اس کا عملی نمونہ برصغیر میں انگریز کی آمد سے پہلے ہر سطح پر نمایاں تھا ۔ اپنی تہذیب کی بقا کے لئے مسلمانوں نے تعلیمی اداروں سے کام لیا ۔ اِن چند نمائندہ اداروں کی تہذیبی و دینی خدمات کی تفصیل دی جا رہی ہے ۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ

مدرسہ عالیہ کلکتہ کا شمار برصغیر کی قدیم ترین اسلامی درس گاہوں میں ہوتا ہے یہ اپنی نوعیت کی وہ واحد درس گاہ ہے جو تقریباً دو سو سال تک اسلامی تعلیم و تدریس کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہی اس مدرسہ کے پہلے نگراں یا اوّل مدرس مُلّا مجد الدین تھے ۔ اس مدرسہ کے حوالے سے امیر الاسلام ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے قیام کے پسِ منظر کی وضاحت پروفیسر امیر الاسلام (75-1974، ص35) اِن الفاظ میں کرتے ہیں :

> ''انگریزوں کے دن بدن بڑھتے ہوئے غلبے کے پسِ منظر میں بنگال کے مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ان کا دین و ایمان اور ان کی اسلامی تعلیمات اور روایات غیر محفوظ ہیں ۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے دینی تعلیم کی ترغیب اور مذہب کے تحفظ کے لئے ایک اسلامی تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا ۔''

مسلمانوں کے مدرسہ کے قیام کے لئے ایک درخواست ناظم صوبہ بنگال وارن ہیسٹنگز کو دی۔ یہی اِس کا قانونی عہدہ تھا۔ کمپنی کی حکومت بھی کچھ عرصہ سے ایسے افراد کی ضرورت محسوس کر رہی تھی جو اسلامی قانون کے ماہر ہوں۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں مختلف فرائض انجام دے سکیں۔ چونکہ حکومت کا نظم ونسق بڑی حد تک سابق طور پر چل رہا تھا۔ دونوں طرف کا احساس تھا ۔گورنر جنرل نے مدرسہ کے قیام کی تجویز کو قبول کرلیا۔ اور اُس مدرسہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا، اِس کا اظہار عبداللہ ملک (1978،ص20) اپنے الفاظ میں اِس طرح کرتے ہیں:

''اس زمانے میں گو مسلمانوں سے عنانِ حکومت چھن گئی تھی تاہم گورنمنٹ میں ان کا اثر باقی تھا۔ عدالتوں کی زبان فارسی تھی۔ فوج داری اور شہادت کا قانون جاری تھا۔ وہ شرع محمدی کے مطابق تھا۔ اس لئے گورنمنٹ کو ایسے عہدیداروں کی ضرورت تھی جن کو شرع محمدی کا علم ہو اور عدالتوں کی کاروائی سے واقف ہوں۔ اس لئے اس مدرسہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا۔''

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مقاصد کے سلسلے میں پروفیسر امیر الاسلام (75-1974،ص37) رقمطراز ہیں:

''مسلمانوں کے نقطہءِ نظر سے اس مدرسہ کے قیام کا اصل مقصد دین کا احیاء اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت تھا جو باقی رہا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسی قسم کے مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں نے عیسائی مشنریوں کی یلغار کا مقابلہ کیا۔''

1790ء تک مدرسہ میں درسِ نظامیہ کی تدریس ہوتی رہی۔ بعدازاں جدید قواعد وضوابط بنائے گئے۔ نصاب میں حکمت، عقائد، فقہ، ہیئت، ریاضی، اقلیدس، منطق، بلاغت، صرف ونحو شامل تھے۔ نصاب کی تفصیل سیّد محمد سلیم نے اس طرح بیان کی ہے۔

نصابِ تعلیم

نصابِ تعلیم کے بارے میں سیّد محمد سلیم نے یہ تفصیل دی ہے :

الف۔ کتب اردو

اخلاق: ترجمہ کریما

ادب: باغ وبہار از میر امن دہلوی، قواعد اردو از جان گلکرسٹ، شاخ مرجان

جغرافیہ: اصولِ جغرافیہ اردو از حکیم محمد شریف

تاریخ: تاریخ چین، تالیف جیمس کارکرن۔

حساب: اصولِ حساب

علوم طبیعی: علم آداب (کذا) علم ہیئت، علم آب وہوا، علم مناظر ومرایا، علم الیکٹرسٹی،

تالیف: پنڈت اجودھیا پرشاد ومنشی شیو پرشاد دہلوی۔

ب۔ کتب فارسی

صرف ونحو: حروفِ تہجی، آمدنامہ، صرف پارسی تصنیف واتارام برہمن، شجرۃ الامانی تصنیف مرزا محمد حسن قتیل فریدآبادی، نہر الفصاحت حدائق البلاغت تالیف

شمس الدین فقیر۔

ادب: سکندر نامہ، انور سہیلی، دیوان ناصر علی، دفتر اوّل علامہ ابوالفضل۔

تاریخ: تاریخ بنگال (ہسٹری آف بنگال از مارش مین) مترجمہ راقم سلطان الاخبار، تواریخ ہندو (ہسٹری آف انڈیا از مارش مین) مترجمہ مولوی عبدالرحیم گورکھپوری، تواریخ انگلینڈ۔

ج۔ کتب عربی

صرف: میزان منشعب، پنج گنج، زبدہ ہدایت الصرف، شافیہ۔

نحو: مائۃ عامل، شرح مائۃ عامل، ہدایت النحو۔ کافیہ۔

ادب: نفحۃ الیمن، تاریخ واقدی مطبوعہ باہتمام سیکرٹری فورٹ ولیم کالج، دیوان متنبّی، مقامات حریری۔

حساب: خلاصۃ الحساب۔

ہندسہ: تحریر اقلیدس۔

ہیئت: سبع شداد، تشریح الافلاک، شرح چغمینی

منطق: میزان منطق، شرح ملّا، شرح تہذیب، قطبی معہ میر، مسلم

حکمت: میبذی، صدرا

بلاغت: مختصر و مطوّل

کلام: عقائد نفسی

فقہ: شرح وقایہ، الاشباہ والنظائر، ہدایہ۔

اصول فقہ: نورالانوار، توضیح معہ تلویح۔

فرائض: سراجیہ معہ شریفیہ

حدیث: جواہر الاصول، مشکوٰۃ المصابیح

تفسیر: بیضاوی (ڈھائی پارے)

اصلاحی کمیٹیوں کے علی الرغم یہ مدرسہ اپنی دینی حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ بنگال کے مختلف اضلاع میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں پونے دوسال میں مدرسہ سے فارغ ہوکر ہزاروں طلبہ اور علماء پھیل گئے۔ صوبہ بھر میں وعظ ونصیحت، تبلیغ وارشاد کا کام یہی علماء انجام دیتے رہے۔

دارالعلوم دیوبند

سہارن پور کے ایک قصبہ دیوبند میں یہ مدرسہ 1867ء کو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھوں قائم ہوا جو مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور مولانا مملوک علی ایک طرف شاہ ولی اللہ کے تعلیمی مکتب کے پروردہ تھے اور دوسری طرف سیّد احمد شہید کی تحریک کے باقی ماندہ لوگوں میں سے تھے۔ مولانا محمد یعقوب اس مدرسہ کے پہلے سربراہ تھے۔ 9 سال مدرسہ بالکل ابتدائی حالت میں رہا۔ نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم اور علمی مرکز میں تبدیل ہوگیا۔ دیوبند کے بارے میں حکیم محمد سعید (1984، ص112) لکھتے ہیں:

''دیوبند علماء کے مدارس ومکاتب نے نہ صرف تعلیم کو عام کیا بلکہ آزادی کی جنگ کے مجاہد پانِ اسلام کے علم بردار اور ملّی تہذیب کے محافظ پیدا کیئے......دیوبند علماء نے بڑا کام کیا اور یہ کام شاہ ولی اللہ کی تعلیمی تحریک کا ثمر تھا۔''

اِس وقت نہ صرف اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب کی بقا کے لئے بلکہ خود مسلمانوں کو مسلمان رکھنے کے لئے ضرورت تھی کہ عظیم بنیادوں پر ایک عظیم درسگاہ قائم کی جائے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو الحاد اور بے دینی کے فتنۂ عظیم سے محفوظ رکھ سکے۔ خدائے بزرگ وبرتر کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ذریعے سے یہ توقعات بدرجہ اَتم پوری ہوئیں۔ دارالعلوم دیوبند کی علمی خدمات کے بارے میں مثبت تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے شیخ محمد اکرام (1975، ص ص 76-75) لکھتے ہیں:

''گزشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے دیوبند کا نصاب ضروریات کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی متشرقین یا دَورِ حاضر کے مصری علماء کی تصانیف سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی علمائے ندوۃ العلماء کو ہے۔ لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے وہاں سے ہزاروں علماء اور طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں جنہوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کیئے۔''

اس عظیم الشان ادارے کی دینی خدمات کے بارے میں مشہور سکالر مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (1961، ص335) رقمطراز ہیں:

''دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم کر کے نکلنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ ہے جن میں پانچ ہزار وہ فارغ التحصیل علماء ہین جنہوں نے سند فراغ حاصل کی بیرون ہند کے فارغین کی تعداد پانچ سو ہے۔ جن میں یاغستان، افغانستان، خیوا، بخارا، قازان، روس، آذربائیجان، مغرب اقصیٰ، ایشیائے کوچک' تبت، چین، جزائر بحرالہند، حجاز اور دوسرے ملکوں کے طلباء شامل ہیں۔''

علمائے دیوبند کے خلوص، تقویٰ والہیّت سے کبھی کسی صاحبِ علم ودانش کو اختلاف وانکار کی گنجائش نہ ہوئی۔ ''دارالعلوم دیوبند'' کے قیام کو ایک صدی سے اوپر گزر چکا ہے دارالعلوم کی گزشتہ صد سالہ خدمات پر نظر کی جائے تو کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دیوبند قوم کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔ یہ خدمت تہذیبی اور علمی تھی۔ اِن خدمات کے اعتراف میں راجہ طارق محمود (1985، ص336) (بحوالہ علامہ رشید مصری) رقمطراز ہیں:

''اگر مَیں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔ اسی دارالعلوم نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علومِ عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔''

اشاعتِ علم کے ساتھ اِس مدرسہ نے اصلاح عقائد اور ردّ بدعات کا کام بڑے پیمانے پر

سرانجام دیا۔ یہاں کے فارغ طلباء نے پیغام ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا اس خدمت کے حوالے سے دارالعلوم دیوبند کی تہذیب، تبلیغ دین اور رسم ورواج کے تحفظ پر سیّد محمد محبوب رضوی (1954، ص457) رقمطراز ہیں:

''ہندو پاکستان (برصغیر) کے مسلمان دینی زندگی میں دیوبند کے فضلاً کے ممنون احسان ہیں ۔ ان کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں سے ملک کے گوشے گوشے میں بدعات اور غلط رسوم ورواج کا خاتمہ ہوا، عقائد کی درستی، تبلیغ دین اور فرِق ضالہ سے مناظرہ وغیرہ ان حضرات کے نمایاں کارنامے ہیں۔''

دیوبند کے پورے نظامِ تعلیم پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصد تہذیب کا تحفظ ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ذہنی وسعت اور پیشہ ورانہ آزادی پیدا کرنا بھی تھا۔ پیشہ وفنون کے حوالے سے کمال الدین حیدر (1907، ص154) رقمطراز ہیں:

''خطاطی کو ایک مضمون بنایا گیا، نیز مختلف حرفتوں کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا گیا مثلاً جلد سازی، کپڑا بننا اور سینا وغیرہ۔''

دیوبند کے نظامِ تعلیم میں اصولی طور پر صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ مسلم تہذیب کا تحفظ بھی تھا۔ پروفیسر خورشید احمد (1982، ص83) لکھتے ہیں:

''چونکہ شروع ہی سے مقصد تعلیم کے ساتھ دینِ اسلام اور مسلم ثقافت کا تحفظ تھا۔ اس لئے دیوبند اصلاحی تحریک کا مرکز رہا۔ دیوبند نے جو جدوجہد غلط رسومات وبدعات کے خلاف

شروع کی تھی وہ دیوبند میں جاری ہیں ۔ اسی طرح نکاح
بیوگان اور عورت کے حقِ وراثت کے بارے میں دیوبند نے
مثبت اصلاحی کام سرانجام دیا۔''

کیونکہ زبان تہذیب کا حصہ ہے۔اسلئے اُردو زبان کی ترویج میں دارالعلوم دیوبند کا کردار قابلِ ستائش ہے۔اس حوالے سے قاضی جاوید(1998،ص146) لکھتے ہیں:

''دیوبند نے اپنے دَور میں دینی علوم کی خدمت کی روایت کو
قائم رکھنا تھا۔ضمناً یہ بھی اس نے خود اُردو کی ترویج میں بڑا
حصہ لیا۔اس خصوصیت سے دین پسند عوام میں اُردو کی
مقبولیت میں اضافہ ہوا۔''

نصاب

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم اجتماعی ارتقاء کے نتیجہ میں تشکیل ہوتا ہے۔دیوبند کے نصاب میں اس خاصیت کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔مُلاّ نظام الدین سہارن پوری بانی درسِ نظامی نے اس کو مرتّب کیا۔ارتقائی عمل کے بعد اس میں بعض مضامین مثلاً علمِ حدیث،علم وادب اور علمِ تاریخ کو شامل کیا گیا۔دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم کے سلسلے میں پروفیسر عبدالسلام چوہدری (1996،ص79) رقمطراز ہیں:

''نصاب قرآنی علوم اور علمِ حدیث کو اوّلیت دی گئی ۔صحاح
ستّہ (احادیث کی چھ مستند کتابیں) نصاب میں شامل کی گئیں۔
عربی ادب کے علاوہ تاریخ کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا۔
عربی ادب،تفسیر، اصول الکلام، حدیث، اصول حدیث،

اصول اِفتاء فقہ، اصول فقہ، منطق، ریاضی، تجوید، خوش نویسی
اور حکمت شریعہ کی تعلیم شامل تھی۔ یہ نصاب چار درجوں،
ابتدائی درجہ، متوسط درجہ، اعلیٰ درجہ اور تکمیل درجہ پر تھا۔ یہ
نصاب عام طور پر نو سال میں مکمل ہوتا تھا۔''

''دارالعلوم دیوبند'' کے نصابِ تعلیم کی درجہ دار تقسیم سیّد محمد محبوب رضوی نے بیان کی ہے۔

سال اوّل

صرف: 1- میزان از سراج الدین اودھی

2- منشعب از شیخ حمزہ بدایوانی

3- پنج گنج (تا خاصیت ابواب) از شیخ حمیدالدین حاکم کیچ مکران

4- صرف میر از میر سیّد شریف جرجانی

5- علم الصیغہ از مفتی عنایت احمد

6- فصول اکبری از علی اکبر الہ آبادی

نحو: 1- نحو میر از میر سیّد شریف جرجانی

2- شرح مائتہ عامل از مُلّا محمد صادق

3- ہدایۃ النحو از ابوحیان نحومی

ادب: 1- مفید الطالبین از مولانا محمد احسن نانوتوی پروفیسر بریلی کالج

منطق: 1- صغریٰ۔ کبریٰ از سیّد شریف جرجانی

2- ایساغوجی از مولانا اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری

3- مرقات از فضل امام خیر آبادی

سال ثانی

صرف: 1- فصول اکبری از علی اکبر الہ آبادی

2- مراح الارواح از احمد بن علی بن مسعود

نحو: 1- کافیہ از جمال الدین ابن حاجب

2- شرح جامی از مُلّا نور الدین عبد الرحمان جامی

3- ابن عقیل از عبد اللہ بن احمد معروف بہ ابن عقیل

ادب: 1- نفحۃ الیمن از شیخ احمد شردانی یمنی

2- نفحۃ العرب از مولانا اعزاز علی دیوبندی

فقہ: 1- نور الایضاح از حسن بن علی شرنبلانی

2- قدوری از ابو الحسن احمد معروف بہ قدوری

منطق: 1- شرح تہذیب تا ضابطہ از علامہ عبد اللہ یزدی

2- قطبی یعنی شرح شمسیہ از محمد بن محمد قطب الدین رازی

3- رسالہ میرزاہداز میر محمد زاہد بن قاضی اسلم ہروی

تاریخ: 1- رسالہ سیرت از مولانا عمادالدین

سال ثالث

نحو: 1- شرح جامی از مُلاّ نورالدین عبدالرحمان جامی

معانی وبیان: 1- تلخیص المفتاح از جلال الدین محمد قزوینی خطیب دمشق

عروض: 1- عروض المفتاح از ابو یعقوب یوسف سکاکی

ادب: 1- مقامات حریری از علامہ ابومحمد قاسم بن علی الحریری

تاریخ: 1- دروس التاریخ الاسلامی (اوّل وثانی)

از شیخ محی الدین الخیاط

فقہ: 1- اصول الشاشی از نظام الدین شاشی

2- کنزالدقائق از ابوالبرکات حافظ الدین نفسی

منطق: 1- سلم العلوم از مولوی محبّ اللہ باہری صدر الصدور

2- شرح مُلاّ حسن از مُلاّ محمد حسن بن قاضی غلام مصطفیٰ لکھنوی

سال رابع

معانی وبیان: 1- مختصر المعانی از سعدالدین مسعود تفتازانی

تاریخ: 1- دروس التاریخ الاسلامی ثالث ورابع، از شیخ محی الدین الخیاط

کلام: 1- شرح عقائد نسفی از سعد الدین مسعود تفتازانی

فقہ: 1- نور الانوار از مُلّا جیون جون پوری

2- شرح وقایہ از عبداللہ بن مسعود صدر الشریعہ

مناظرہ: 1- رشیدیہ از شیخ عبدالرشید جون پوری

2- شرح مُلّا جلال

حکمت: 1- میبذی از قاضی کمال الدین میبذی قبل

سال خامس

تاریخ: 1- تاریخ ابوالفدا اسمعیل حموی

کلام: 1- شرح عقائد نسفی از سعد الدین مسعود تفتازانی

2- شرح خیال از شمس الدین امد معروف بہ خیالی

3- مسامرہ از کمال الدین ابن الشریف

فقہ: 1- حسامی از حسام الدین محمد

2- ہدایہ اوّلین از برہان الدین مرغینانی

حدیث: 1- مشکوٰۃ المصابیح از شیخ ولی الدین عراقی

2- نخبۃ الفکر از علامہ ابن حجر عسقلانی

تفسیر: 1- الفوز الکبیر از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

2- جلالین از جلال الدین سیوطی

سال سادس

ادب: 1- دیوان متنبّی وتا ردیف عین، از احمد بن حسین متنبّی

2- دیوان حماسہ (تین باب) از ابوتمام حبیب بن اوس طائی

3- سبعہ معلقہ از حماد (راویہ)

تاریخ: 1- تاریخ ابوالفدا از ابوالفدا اسمٰعیل حموی

فقہ: 1- توضیح از صدر الشریعہ عبیداللہ بن مسعود

2- تلویح از علامہ سعد الدین مسعود تفتازانی

3- مسلم الثبوت از مولوی محبّ اللہ بہاری

4- ہدایہ از برہان الدین مرغینانی

فرائض: 1- سراجیہ از سراج الدین سجاوندی غزنوی چھٹی صدی ہجری

حکمت: 1- تصریح از امام الدین بن لطف اللہ لاہوری

2- شرح چغمنی از موسیٰ بن محمود عرف، قاضی زادہ

هندسہ: 1- رسالہ اصطرلاب از ابوالحسن ثابت بن قرہ

2- تحریر اقلیدس از نصیر الدین محقق طوسی

سال سابع

معانی و بیان: 1- مطوّل از سعد الدین مسعود تفتازانی

کلام: 1- میر زاہد (امور عامہ) از میر محمد زاہد ہردی

2- شرح عقائد جلالی از جلال الدین دوانی

تاریخ: 1- تاریخ ابوالفدا از ابوالفدا اسمٰعیل حموی

منطق: 1- تصدیقات شرح سلم از حمد اللہ سندیلوی

2- تصورات شرح سلم از قاضی مبارک بن محمد عائم گوپاموئی

فلسفہ: 1- صدرا (دو فصل) از صدر الدین شیرازی

2- شمس بازغہ (حرکت) از مُلّا محمود بن محمد فاروقی جون پوری

تفسیر: 1- بیضاوی (بقرہ) از عبد اللہ بن عمر بیضاوی

طب: 1- موجز قانونچہ از ابن النفیس قرشی

2- شرح اسباب از برہان الدین نفیس کرمانی

3- نفیسی اسباب از برہان الدین نفیس کرمانی

4- حمیات قانون از شیخ الرئیس حکیم بوعلی سینا

نوٹ:- یہ کتب بلحاظ استعداد کئی سالوں پر پھیلائی جاسکتی ہیں۔ سال سابع تک قدیم تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ اس کو "موقف علیہ" کہتے ہیں۔

سال ثامن

دورۂ حدیث:

1- صحیح بخاری از ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری

2- صحیح مسلم از مسلم بن حجاج نیشاپوری

3- جامع ترمذی از محمد بن عیسٰی ترمذی

4- سنن ابی داؤد از امام ابوداؤد سجستانی

5- سنن نسائی از عبدالرحمٰن بن شعیب نسائی

6- شمائل ترمذی از ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی ترمذی

7- طحاوی از ابوجعفر احمد طحاوی۔

8- سنن ابن ماجہ از محمد بن ماجہ قزوینی۔

9- مؤطا امام محمد از محمد بن حسن شیبانی۔

10- مؤطا امام مالک از امام مالک۔

سال تاسع

دورہ تفسیر: 1- تفسیر کامل از امام بن کثیر

2- تفسیر کامل از امام عبداللہ بن عمر بیضاوی

تجوید القرآن: 12 کتب

دارالعلوم علی گڑھ

جنگ آزادی 1857ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریز ان کے پرانے تعلیمی نظام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ مشنری تعلیمی اداروں کی آڑ میں تعلیم کے پردے میں عیسائیت کا پرچار کر رہے ہیں۔ اس کی آڑ میں مسلمانوں کی دینی بنیادوں کو مجروح کر رہے تھے۔ سر سیّد نے 1875ء میں علی گڑھ کے مقام پر مدرسہ قائم کیا۔ آپ نے اس ادارے کی مدد سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا مداوا کیا۔ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دلوں میں پھیلی ہوئی نفرت کو فرو کیا۔ اس ادارے کے قیام کے حوالے سے نذیر چوہدری (75-1974، ص80) لکھتے ہیں:

> ''سر سیّد نے وہاں جو ننھا سا پودا لگایا تھا، وہ ایک قد آور درخت بن گیا اور اس کی چھاؤں میں مسلمانوں نے جہالت اور پسماندگی سے بچ کر سکھ اور اطمینان کا سانس لیا۔ وہ معمولی مدرسہ جو گھاس پھونس کے معمولی مکان میں شروع ہوا۔ ایک عظیم جامعہ کا روپ دھار چکا ہے اور وہ تحریک جس کی مخالفت

خود مسلمانوں نے کی وہ ان کی تہذیب وثقافت کی امین بن
چکی ہے۔''

چند مخصوص ہستیوں کو چھوڑ کر پڑھے لکھوں میں جو معروف نام سامنے آئے ہیں وہ عموماً علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہوں یا جج، انگریزی عہدہ دار ہوں یا قومی خدمات ادا کرنے والے سب علی گڑھ کے فرزند نظر آئیں گے۔ دینی اور دیگر خدمات کے بارے میں نذیر چوہدری (75-1974، ص84) مزید لکھتے ہیں:

''تعلیم، مذہب، سیاست، ادب، تاریخ، صحافت تہذیب میں
بیک وقت ایک امتیاز حاصل کیا ہوا اور مستقبل کی علمی، مذہبی،
سیاسی اور ثقافتی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہوا۔ بالآخر
مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت
ہوا ہو وہ ادارہ علی گڑھ ہے۔''

عقلی اور نقلی علوم میں ہم آہنگی کا نصب العین سرسیّد احمد خان کی علمی کاوش کا مقصد تھا تعلیم کی روح مذہبی ہونی چاہیئے۔ لیکن جہاں ہم نے اس حقیقت کو فراموش کیا کہ انسان روح کے علاوہ ایک جسم بھی ہے وہاں تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ معاشی مسئلے کو حل کیئے بغیر کوئی قوم دنیا میں عزت وقار کی زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ اسلام نے ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی بلکہ دین کی مدد کی ہے۔ چنانچہ سرسیّد نے جس درسگاہ کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔ اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کے الفاظ محمد امین زبیری (1964، ص55) پیش کرتے ہیں:

''مگر مسلمانوں کی تعلیم کا حال اور قوموں کی تعلیم سے
جو ہندوستان میں آباد ہیں بالکل مختلف ہے۔ ان کا مذہب،

ان کی مذہبی تعلیم اور عام تعلیم میں ایسا ملا ہوا ہے جیسے
جسم و جان۔ جب ان کو علیحدہ کیا جائے گا، جسم بے جان
ہو جائے گا اور کبھی اس قسم کی بے جان تعلیم سے اغراض پوری
نہ ہوں گی۔"

سر سیّد کی تعلیمی پالیسی کے حوالے سے مذہب اور تعلیم کے باہمی ارتباط کا ذکر کرتے ہوئے حکیم محمد سعید (1988، ص 111) لکھتے ہیں:

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا نیچرل سائنس بائیں ہاتھ
میں اور لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔"

نصاب

سر سیّد احمد خان نصابِ تعلیم میں دین کی معتدل مقدار ہی گوارا کرتے تھے۔ اس بارے میں سیّد افتخار عالم (1975، ص 133) لکھتے ہیں:

"مگر مذہبی کورس کو ایسی معتدل تعداد پر قرار دینا ضروری ہوگا
جس سے دیگر علوم کی تعلیم پر حرج نہ پڑے۔"

بمقام امرتسر تقریر کرتے ہوئے سر سیّد احمد خان نے نصابِ تعلیم کی جو وضاحت کی اُسے محمد عبداللہ خویشگی (1952، ص 277) بیان کرتے ہیں:

"مسلمانوں کو لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔
یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی
زبان ہے جو فصاحت اور بلاغت میں لاثانی ہے۔ مگر افراط

وتفریط نہ ہو۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں۔"

سرسیّد اپنے دَور کے اسلامی مدارس کے نصاب اور احیاءِ تعلیم سے مطمئن نہیں تھے ان کے عدم اطمینان کا ایک سبب تو یہ تھا کہ روایتی نصاب، حال کے تقاضوں کو قطعاً پورا نہیں کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان مدارس میں معاشی ضروریات کی تکمیل کا سرے سے اہتمام نہیں تھا۔ تیسرے یہ کہ ان اداروں سے تحصیلِ علم کے بعد فرقہ واریت اور مذہبی تنازعات میں اضافہ ہوتا تھا۔ اِن اداروں کی بے اثری اور بے بضاعتی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد اسماعیل پانی پتی (1963، ص412) لکھتے ہیں:

"وہ زمانہ اب نہیں رہا کہ ہم لوگوں کو مسجد اور خانقاہوں میں بٹھا کر اور ان کو خیرات کی روٹی دے کر، چھوٹے اسکول اور مکتب قائم کر کے قومی تعلیم کو ترقی دے لیں گے۔ یہ کام اس وقت مفید ہوتے ہیں، جبکہ قوم نے اعلیٰ سے اعلیٰ سامان قومی تعلیم کا مہیا کر لیا ہو۔"

مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی پر انمٹ نقوش دارالعلوم علی گڑھ کے حصے میں آئے۔ علمی ثمرات سے مسلمان معاشرہ سرفراز ہوا۔ علی گڑھ کی تہذیبی خدمات کے بارے میں مولانا محمد اسماعیل پانی پتی (1993، ص13) لکھتے ہیں:

"اپنے ماہانہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے وہ اپنے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی خیالات مسلمانوں میں مقبول بناتے رہے۔"

علی گڑھ نے انگریزوں کے تعلیمی نظام اور اس کی ہیئت کو قبول کر کے اس کے اندر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ یہ چیز علی گڑھ کے مزاج کا ایک جزو بن گئی۔ علی گڑھ نے جو ذہن تیار کیا وہ مصالحت کے رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ لیکن سرسیّد احمد خان اصلاح وتجدید کا دائرہ مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط کرنا چاہتے تھے۔ سرسیّد کے تہذیبی نظریات کے حوالے سے عبدالمجید سالک (س ن، ص363) لکھتے ہیں:

''خود غرضی، عزت وغیرت، ضبط اوقات، اخلاق، صدقِ مقال، دوستوں سے راہ ورسم، لہجہ، طریق زندگی، صفائی، طرزِ لباس، طریق اکل وشرب، تدبیرِ منزل، رفاہ، عورتوں کی حالت، کثرتِ ازواج، رسومات شادی، رسومات غمی، ترقی زراعت، ترقی تجارت، تہذیب کا جزو ہیں۔''

اُردو زبان اور فارسی زبان ورسم الخط کو رواج مغلیہ عہد میں ہوا تھا لیکن ان کی ترقی واشاعت میں ہندوستان کی تمام اقوام نے بلا اختلاف مذہب ومسلک حصہ لیا تھا۔ اُردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لئے علی گڑھ نے بہت کام کیا۔ پروفیسر عبدالسلام چوہدری (1996، ص88) اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''سرسیّد احمد خان جانتے تھے کہ عربی اور فارسی زبان کے زوال پذیر ہونے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اُردو زبان کا پڑھنا لکھنا آسان ہے سرسیّد اور ان کے رفقاء نے اُردو کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اُردو زبان کو بیش بہا ادبی خزانہ بنا دیا۔''

علی گڑھ نے اسلامی تہذیب کی حفاظت کے لئے جو کردار ادا کیا اس کے بارے میں نذیر چوہدری (1974، ص80) تحریر کرتے ہیں:

''مسلمانوں کی تہذیب کو انگریزی تہذیب میں ضم کرنا نہیں بلکہ اس کو انفرادی مقام دلانا ہے اور یہ کہ یہ منصوبہ شریعتِ اسلامی کے خلاف نہیں بلکہ اس کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے۔ جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کی حفاظت کر سکیں۔''

علی گڑھ کی ادبی خدمات بہت زیادہ ہیں۔علی گڑھ نے الطاف حسین حالؔی جیسے شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ان ادیبوں نے انقلابی ادب کی تحریک چلائی جس نے قوم کو ایک نیا نظریہ اور نئی اُمنگ بخش دی۔ان ادبی اور علمی تحریکوں کی بدولت ہندوستان میں وہ شخصیات پیدا ہوئیں جو ادبی اُفق پر اور سیاست پر چھا گئیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ

مسلمانوں میں دوسرے مکتبِ فکر کی ایک ذیلی شاخ بھی تھی۔ وہ لوگ وقت کے تقاضوں کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اور قدیم نصابِ تعلیم کی اصلاح کے بھی قائل تھے۔ یہ لوگ نصاب میں پیوند کاری کے بجائے ایک نیا آمیزہ اور مرکب تیار کرنا چاہتے تھے۔مدرسہ الٰہیات کے سالانہ جلسہ کے موقع پر علماء کی ایک تنظیم بنام ندوۃ العلماء 1892ء میں قائم ہوئی۔اشاعتِ اسلام اور قیام مدارس اس تنظیم کے اہم مقاصد تھے۔اس کے صدر مولانا محمد علی مونگیری تھے۔اس تنظیم کا اہم کارنامہ مدرسہ ندوۃُ العلماء لکھنو ہے۔ندوہ قدیم نظام کو جدید دَور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کا نام ہے۔مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، شاہ عبدالعزیز، مولانا عبدالحق دہلوی اور

مولانا شبلی نعمانی ندوہ کے حوالے سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں مدرسہ ندوۃُ العلماء کی دینی خدمات کے حوالے سے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (1961، ص358) فرماتے ہیں:

> ''ندوۃ کو بحمداللہ اپنے مقاصد میں قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے علماء تیار ہوئے جو جدید دنیائے اسلام کے لئے قابلِ تقلید ہیں۔ان فضلاء نے اسلامی ادب، علمِ کلام، تاریخ سیرت نبوی کے موضوع پر نہایت قیمتی لٹریچر فراہم کیا۔''

ندوۃ العلماَ کے قیام کا مسلمانوں میں نہایت گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔اسلامی اور قومی انجمنوں نے تائیدی تجویزیں اور ریزولیوشن بھیجے۔مختلف اضلاع سے سپاس نامے پیش کئے گئے۔ملک کے طول وعرض سے پر جوش تحسین کے پیغامات موصول ہوئے۔قدیم تعلیمی اور دینی حلقوں کے نامور اساتذہ اور علمانے تائید کی۔جگہ جگہ سے دفود آئے اور ندوۃ العلماَ کا تعارف کرانے کی دعوت دی گئی۔ندوۃ العلماَ کی تہذیبی خدمت کے بارے میں ڈاکٹر محمد اسلام (1973-1974، ص ص103-104) رقمطراز ہیں:

> ''چونکہ شبلی اسلامی تہذیب کی ترجمانی چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے کمال انشاَ پردازی سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے تہذیبِ مغرب سے مسحور دل ودماغ کو تہذیبِ اسلامی کے تصور سے مانوس کرایا۔اس میں کامیابی حاصل کی۔انہی کے اثر سے مسلمانوں میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصر پیدا ہوئے۔''

ندوۃ العلماٗ کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ اس نے علمی اور تعلیمی حیثیت سے عالم اسلام کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا۔ مصر کے عالم اس ادارہ میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ندوہ کے اہلِ قلم سارے عالم اسلام سے وابستہ رہے ادبی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے۔ زبان و بیاں کے حوالے سے علامہ سیّد سلیمان ندوی (1940، ص 441) رقمطراز ہیں:

> ''اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماٗ کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کُھلا۔ اسلام اور علومِ اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کی نظر میں آئے۔ زبان و بیان کے نئے پیرائے معلوم ہوئے۔''

اصلاح احوال کے بارے میں سیّد ابوالحسن علی ندوی (1961، ص 141) بیان کرتے ہیں:

> ''اس ادارہ کی اساس علی گڑھ کی تعلیم جدید اور تہذیب مغربی کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے برخلاف خالص دینی تھی، یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا۔ اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا۔''

نصاب

تنظیم ندوۃ العلماء نے بڑی جدو جہد کے بعد ایک نصابِ تعلیم پیش کیا۔ ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم کے بارے میں پروفیسر سیّد محمد سلیم (1980، ص ص 290-289) تحریر کرتے ہیں:

''اس میں منطق وفلسفہ کو کمتر اہمیت دی گئی اور تفسیر وحدیث کو مناسب مقام دیا گیا۔ جدید اسلوب کے مطابق نئی کتب تحریر کرائی گئیں، جن میں اسلامی روح جھلکتی ہے۔ عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح دی جانے لگی۔ جدید علوم اور انگریزی علوم کا بھی انتظام کیا گیا۔ موجودہ نصابِ تعلیم ندوہ میں تعلیم کے تین مرحلے ہیں۔ ابتدائیہ، عالیہ، فاضلیہ، شامل تھے۔''

تفصیلِ نصاب

العالمیہ

السنۃ الاولیٰ

1۔ صرف: تمرین الصرف الجزء الاوّل

2۔ نحو: تمرین النحو (الجزء الاوّل)

3۔ ادب: قصص النبیین (الجزء الاوّل والثانی) المحاورۃ العربیۃ ودروس الاشیاء

4۔ تعلیم الاسلام: (از مولانا حکیم سیّد عبدالحئی)

5۔ حساب: عبارت نویسی

6۔ فارسی: عبارت نویسی

السنۃ الثانیہ

1۔ صرف: تمرین الصرف (الجزء الثانی)

2۔ نحو: تمرین النحو (الجزء الثانی)

3۔ ادب: قصص النبیین (الجزء الثالث)، القراءۃ الراشدہ (الجزء الاوّل والثانی)

4۔ تجوید القرآن:

5۔ دینیات: اسلام کیا ہے؟ (از مولانا منظور نعمانی)

6۔ فارسی: اُردو عبارت نویسی

السنۃ الثالثہ

1۔ صرف ونحو: ہدایت النحو (تا بحث حرف) منہاج الصرف

2۔ تجوید: جمال القرآن (از مولانا شرف علی تھانوی)

3۔ ادب: القراءۃ الراشدہ (الجزء الثالث) کلیہ ودمنہ (منتخب ابواب)

4۔ تاریخ اسلامی: دروس التاریخ الاسلامی (الجزء الاوّل والثانی)

5۔ قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (چند سورہ)

6۔ حدیث: ریاض الصالحین (نصف آخر)

7۔ فقہ: نورالایضاح

8۔ انشاء: معلم الانشاء (الجزء الاوّل)

السنۃ الرابعہ

1۔ نحو: شرح شذور الذہب

2۔ انشاء: معلم الانشاء (الجزء الثانی)

3۔ ادب: منشورات من الادب۔ (از سیّد ابوالحسن علی ندوی)

4۔ تاریخ: دروس التاریخ الاسلامی (الجزء الثالث)

5۔ قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (چند سورتیں)

6۔ حدیث: ریاض الصالحین (نصف الاوّل)

7۔ فقہ: قدوری

8۔ منطق: مبادی منطق

السنۃ الخامس

1۔ قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (چند سورتیں)

2۔ حدیث: مشکوٰۃ المصابیح (نصف الاوّل) معہ مقدمہ شیخ عبدالحق دہلوی

3۔ فقہ: شرح نقایہ (اوّلین)

4۔ ادب: مختارات از سیّدابوالحسن علی ندوی، معلم الانشاء (الجزء الثالث)

5۔ تاریخ: دروس التاریخ الاسلامی (الجزء الرابع)

6۔ جغرافیہ: مبادی

7۔ فلسفہ: مبادی فلسفہ

السنۃ السادسہ

1۔ قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (بقیہ سورہ)

2۔ حدیث: مشکوٰۃ المصابیح (نصف ثانی) نخبۃ الفکر، شمائل ترمذی

3۔ فقہ: ہدایہ (الجزء الاوّل)، سراجیہ معہ مشق

4۔ کلام: العقیدۃ الحسنہ

5۔ ادب: مختارات (الجزء الثانی)، معلم الانشاء (الجزء الثالث)

6۔ جغرافیہ عالم اسلامی: (خصوصاً جزیرۃ العرب)

7۔ انگریزی

السنۃ السابعہ (الاخیرہ)

1۔ قرآن مجید: ترجمہ وتشریح، الفوز الکبیر (از شاہ ولی اللہ۔)

2۔ حدیث: جامع ترمذی کامل، صحیح بخاری (تا کتاب العلم)

3۔ فقہ: ہدایہ (الجزء الثانی) المدخل الی اصول الفقہ (از شیخ معروف الدوالیبی)

4۔ ادب: البلاغۃ الواضحہ ،نصوصِ ادبیہ، انشاء۔

5۔ انگریزی

الفضیلہ

السنۃ الاوّل

1۔ صحیح مسلم کامل، سنن ابی داؤد

2۔ ہدایہ (الجزء الثالث)

3۔ تفسیر بیضاوی (آل عمران)

4۔ سیرت ابن ہشام۔قطعات

5۔ دیوان المتنبّی ۔قصائد مختارات، الحماسہ (باب الاوّل)، الانشاء

6۔ حجۃ اللہ البالغہ (فصول مختارات من الجزء الاوّل)

7۔ محاضرات فی السیاسۃ

ندوۃ العلماء نے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان نیا راستہ بنایا۔اس نے علومِ عربیہ اور اسلامی تہذیب کو صحیح انداز میں پیش کیا۔نصاب کے مثبت نتیجے کے حوالے سے حکیم محمد سعید (1984، ص104) رقمطراز ہیں:

''ندوۃ العلماء نے نئے زمانے کی ضروریات کے مطابق
ایسے نئے علماء پیدا کئے، جو قدامت کے جوہر کو اپنے میں
جذب کئے ہوئے تھے اور نئے زمانے کے تقاضوں سے باخبر
تھے۔''

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

عہد برطانوی میں مسلمان ذہن ایک غیر اسلامی نظامِ تعلیم سے کبھی بھی اپنے کو ہم آہنگ نہ کر سکا۔ اس لئے شدّت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ قومی تعلیم کے مقابلے میں مسلمانوں کی ملّی تعلیم کا انتظام ہو۔ فطری طور پر نگاہیں علی گڑھ کی طرف اٹھیں اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری گرانٹ کو مسترد کر کے اسے ملّی بنیادوں پر استوار اور از سرِ نو منظّم کیا جائے۔ علی گڑھ کے لئے یہ بات ناگوار تھی۔ پُرجوش طلبہ جب اربابِ علی گڑھ سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے علی گڑھ کو چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں ایک ملّی تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ یہ تھی جامعہ ملّیہ اسلامیہ جو 1920ء میں مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں قائم ہوئی۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد دو تھے۔ مسلم ثقافت کا احیاً اور تربیتِ کردار۔ اس ادارے نے دینی علوم اور جدید علوم کی پیوندکاری سے ایسا نظامِ تعلیم تیار کیا جس میں دنیا کو دین کے تابع کرنے کی کوشش کی گئی۔ کفایت شعاری کے حوالے سے شیخ محمد اکرام (1975، ص 154) لکھتے ہیں:

''جامعہ کی صفت اساتذہ اور طلبہ کی سادگی ہے۔ سادگی کے
بغیر کسی طرح ایثار ناممکن ہے اور مسرف انسان کو اپنے
اخراجات پورے کرنے کے لئے جگہ جگہ ضمیر فروشی کرنی پڑتی
ہے۔ اربابِ جامعہ کی یہ خصوصیت قابلِ تعریف ہے کہ کفایت

شعاری کی تعلیم کوانہوں نے اپنے مقاصد میں اہم جگہ دی۔''

کوئی درس گاہ طلبہ کے اقتصادی مستقبل کا سوال حل کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔اس ادارہ نے اسلامی تہذیب کی حفاظت میں اہم کردار ادا کیا۔ جامعہ ملّیہ کی صنعت وحرفت کی تعلیم کے حوالے سے لعل احمد تھہیم (75-1974، ص129) لکھتے ہیں:

''جامعہ نے دستکاری، صنعت وحرفت کوحصول معاش کا ذریعہ بنایا اور مختلف مفید پیشوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی، ڈیری فارمنگ کیمیاوی صنعتوں میں ایسے طلباء کی تربیت کا اہتمام کر رہے ہیں جوفن میں اجتہاد اور کمال پیدا کرسکیں اور بشرطِ ضرورت معقول روزی کمالیں۔''

اُردو ذریعہ تدریس جامعہ ملّیہ کا عہد آفرین کارنامہ ہے۔جامعہ ملّیہ کی اس تہذیبی تحفظ کی کوشش کے بارے میں پروفیسر خورشید احمد (1977، ص91) بیان کرتے ہیں:

''انگریزی کے بجائے جامعہ نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ جامعہ کی یہ حیثیت ملک گیر تھی۔ یہ اقدام ایک انقلابی اقدام تھا۔''

جامعہ ملّیہ کے دارالاشاعت کے بارے میں راجہ طارق محمود (1985، ص ص382-381) لکھتے ہیں:

''ان کتابوں میں سے کئی بچوں کے لئے، کئی افسانے اور ناول اور بعض سوانحی اور علمی ہیں۔ ان کے متعلق ایک جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ جامعہ نے بہترین ہندو اہلِ قلم اور

قائدین کے خیالات اُردو میں منتقل کیے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ کم از کم (دارالاشاعت جامعہ) تو ایسا ہے جو برادرانِ وطن کی نشاۃ ثانیہ کے نتائج فکر اُردو زبان میں منتقل کرنا گناہ نہیں سمجھتا۔''

تحریک عدم تعاون نے ہندوستان میں قومی تعلیم کی تحریک کو جنم دیا شروع میں قومی تعلیم کی کوشش بڑی حد تک ہندوؤں کے زیر قیادت ہوتیں اور جن مسلمان طلبہ نے انگریزی تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا وہ بھی ان ہی نئے قومی تعلیمی اداروں میں داخل ہوئے۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ جو 1920ء میں مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں قائم ہوئی اور اس کا سنگِ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھا۔ 1925ء میں یہ ادارہ دہلی منتقل ہوگیا۔ جامعہ ملّیہ کے مقاصد اور نصاب کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر (1921، ص 83) رقمطراز ہیں:

''ہمارا مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو صرف حسبِ معیار زمانہ حال، تعلیم وتربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں، بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں۔ جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب سے اس قدر کافی بہرہ یاب ہوں کہ مبلغین اسلام اور دوسروں کی امداد سے بے نیاز ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔''

انجمن اصلاح المسلمین

ضلع اعظم گڑھ کے مسلمانوں میں عربی تعلیم کے ساتھ دینی اصلاح کا جذبہ اُبھرا۔ مولانا سخاوت

علی جونپوری کے شاگرد مولانا فیض اللہ اعظم گڑھی تھے اور انہیں کے شاگردِ رشید ابوالبرکات مولانا محمد شفیع تھے۔ جنہوں نے 1906ء میں انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد رکھی۔ انجمن کی تہذیبی خدمت کے حوالے سے مولوی عبدالرحمٰن اصلاحی (1975، ص ص 75-74) رقمطراز ہیں:

''انجمن اصلاح المسلمین کے کارکنوں نے سب سے پہلا قدم معاشرتی اصلاح کے لئے اٹھایا۔ شادی بیاہ کی مشرکانہ اور غیر شرعی رسوم کے مٹانے کی کوشش کی۔ بدعات، منکرات کے ازالہ کی تدبیریں کیں۔ روحانی تربیت کے سامان فراہم کیے۔''

مدرسۃ الاصلاح - سرائے میر

انجمن اصلاح المسلمین 1903ء میں قائم ہوئی۔ مولانا محمد شفیع نے 1909ء میں مدرسۃ الاصلاح کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ درسگاہ سرائے میر مضافات اعظم گڑھ میں ایک چٹیل میدان میں قائم کی گئی تھی۔ 1919ء میں مولانا حمید الدین فراہی جامعہ عثمانیہ کے قیام سے مایوس ہوکر الگ ہو گئے اور اپنے آبائی گھر اعظم گڑھ تشریف لائے اور اسی مدرسہ پر وقت صرف کیا۔

اصل مقصد اس دَور کے مدرسے کا مسلمانوں کی مذہبی اور دُنیوی تعلیم تھا اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدّم رکھا گیا۔ انتظام تعلیم میں مدرسہ کی خصوصیات ذیل ہمیشہ پیشِ نظر رکھی گئیں۔

الف قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتنا

ب اصل علم اور قابلیت کو مطمحِ نظر بنانا نہ کہ کسی محدود نصاب کتب کو

(قرآن مجید وحدیث)

ج   درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع وروحانیت اسلام

د   آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت

ہ   کفایت مصارف باوجود آسائش طلباء

مدرسۃ الاصلاح کی دینی خدمات کے سلسلے میں مولوی عبدالرحمٰن اصلاحی (1975،ص85) لکھتے ہیں:

''مدرسۃ الاصلاح جن بنیادوں پر قائم ہوا تھا ان کا فطری تقاضا تھا کہ وہ صرف ایک علمی درسگاہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس کے ساتھ ایک ایسی درسگاہ ہو جو اپنی ٹھوس علمی اور دینی خدمات کے ساتھ ساتھ سماج کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی حد تک پوری جدوجہد کرے، قرآن پاک کی صحیح دعوت اور اس کے فہم کو عام کیا جائے۔''

مدرسۃ الاصلاح کا نصب العین بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن اصلاحی (1975،ص81) مزید رقمطراز ہیں:

''درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع وروحانیت اسلام کی ترویج، آسانیِ نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت، قرآن وحدیث وفقہ ادب عربی کی طرف اعتناء کفایت مصارف باوجود آسائش طلباء، آزادی اور دینی روح کا تحفظ، تصنیف وتالیف، تبلیغ ودعوت انشاء پردازی، صحافت کے ذریعے تجدید واصلاح کے میدانوں میں بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔''

یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور

ابتداء میں مشرقی علوم والسنہ کا یہ ادارہ اورئینٹل سکول کہلایا۔لیکن 1872ء میں جب کالج کی جماعتوں کا اجراء عمل میں آگیا تو اس کا نام اورئینٹل کالج ہوگیا۔اس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جی۔ڈبلیو لائٹنر مقرر ہوئے۔یونیورسٹی اورئینٹل کالج انجمن پنجاب کی محنت کا ثمر ہے۔جو 1865ء میں معرض وجود میں آئی تھی۔یونیورسٹی اورئینٹل کالج کی تہذیبی کردار کے حوالے سے ابوسلمان شاہجہان پوری (1974،ص89) لکھتے ہیں:

> ''اورئینٹل کالج کی حسن کارکردگی باعتبار وسعت وجامعیت اور باعتبار معیار وفضیلت کسی دوسرے جدید طرز کے تعلیمی ادارے سے کم نہ تھی بلکہ بعض لحاظ سے اورئینٹل کالج برّعظیم کے دوسرے جدید کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مقابلے میں زیادہ باوقار تھا۔اس کی دو حیثیتیں تھیں اوّل یہ کہ ادارہ کم خرچ تھا اور دوم یہ کہ اس کا ذہنی اور علمی معیار بہت بلند تھا۔کیوں کہ یہ قدیم اور جدید کا سنگم ہونے کی حیثیت سے ایک صحت مند تہذیبی وثقافتی روایت کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔''

اسلامیہ کالج پشاور

اسلامیہ کالج کی ابتدا اسلامی کالجیٹ اسکول کی حیثیت سے ہوئی اور ایک سال بعد 1914ء میں اسے کالج کا درجہ دے دیا گیا۔اسلامیہ کالج کا سنگ بنیاد آزادی کے مشہور رہنما مجاہد فی سبیل الحریت حاجی صاحب ترنگ زئی نے رکھا۔صوبہ سرحد میں نواب زادہ عبدالقیوم خان نے تعلیمی میدان میں قائد کی حیثیت سے قدم رکھا اور سر سیّد احمد خان سرحد پکارے گئے۔یہ کالج ان

کی مساعی جلیلہ کا ثمر تھا۔ اسلامیہ کالج پشاور نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت، جذبہ حرّیت کی بیداری اور تحریک آزادی کی آبیاری میں جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یادرہیں گی۔ اس حوالے سے اقبال احمد خان (1975، ص116) لکھتے ہیں:

> ''پٹھانوں میں تعلیم کو عام رواج دینے، ان میں بیداری اور جذبہ حریّت کو اجاگر کرنے میں دارالعلوم اسلامیہ (اسلامیہ کالج) نے خاص، نمایاں اور ناقابلِ فراموش ایسا ہی حصہ لیا ہے۔ جیسا سیاست ہند میں علی گڑھ کالج لے چکا ہے اور اس دارالعلوم نے صوبے سے نکل کر ماورائے سرحد تک کے باشندوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔''

دہلی کالج دہلی

دہلی، سلاطین واہل سیاست کے لئے ہی ایک اہم شہر نہیں رہا ہے بلکہ اُسے علم ودانش کا مخزن، فلسفہ وحکمت کا سرچشمہ اور شعروادب کا دبستان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہیں سے علم کے سَوتے پھوٹے۔ ہر دَور میں درسگاہوں کی بہتات رہی دورِ قدیم کے انحطاط کے بعد نشاۃ الثانیہ کی نشانی کے طور پر وہ علمی مرکز منظر عام پر آیا جو دہلی کالج کہلایا۔ اس کی خدمات کسی طرح قابل فراموش نہیں۔

بابائے اُردو اور دیگر محققین کی صراحتوں کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دہلی کالج وہیں قائم ہوا جہاں عرصہ دراز سے ایک تعلیمی درسگاہ ''مدرسہ غازی الدین'' کے نام سے موجود تھی۔ جو اجمیری دروازے کے قریب تھی یہ مشرقی انداز کی ایک روائتی تعلیم گاہ تھی۔ جس عمارت میں مدرسہ غازی الدین ہے اُسی میں دہلی کالج قائم ہوا۔ اس کا افتتاح 1825ء میں ہوا اور تعلیمی سال

جنوری سے شروع ہو کر دسمبر میں ختم ہوتا تھا۔ دہلی کالج کی تہذیبی خدمت کے حوالے پروفیسر شفقت رضوی (75-1974، ص ص 57-56) سے رقمطراز ہیں:

''اس کالج نے مشرقی ذہن وفکر کو حیاتِ نَو دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ماضی کے دھارے کو مستقبل کی اس سمت کی طرف موڑ دیا جو جدیدیت، عقلیت، حقیقت وسائنس کو اپنی جلو میں لئے تاریخ سازی کی میل اوّل قرار پائی۔ برصغیر میں دہلی کالج کے وجود میں آنے سے جدید انداز فکر ونظر کی شمعیں جگمگا اٹھیں۔''

فورٹ ولیم کالج کلکتہ

یہ کالج 24 نومبر 1800ء میں قائم ہوا۔ کالج کو چلانے کے لئے ایک وسیع عمارت میکڈانلڈ نامی انگریز سے کرایہ پر حاصل کی گئی۔ لارڈ ویلزلی جسے کالج کے قیام سے دل چسپی تھی اور جو کالج کی روح رواں تھا۔ کالج کے قیام کا مقصد عام طالب علموں کی تعلیم کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا بنیادی مقصد انگلستان سے آنے والے نوعمر اور ناتجربہ کار ملازمین کو یہاں کی زبانوں اور یہاں کے علوم کی تعلیم دینا تھا۔

بلاشبہ یہ کالج مخصوص اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لئے قائم کیا گیا تھا، تاہم اس نے اُردو زبان وادب کے ارتقا میں جو حصہ لیا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی لسانی، ادبی اور علمی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ خدمات اسلامی ثقافت کی بقاء کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس ادارے کی ان خدمات کے بارے میں امیر الاسلام (75-1974، ص 48) رقمطراز ہیں:

''نصف صدی میں کالج نے مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ خاص طور پر اُردو کی بڑی

خدمت کی۔ کالج کی تمام علمی اورادبی تصانیف اگرچہ کالج کے طلباء کے لئے تھیں لیکن تصانیف نے اُردو زبان وادب میں نمایاں انقلاب پیدا کیا۔ یہ پہلا ادارہ تھا جس نے باقاعدہ اُردو میں سلیس نگاری کی۔ کالج کی تصانیف میں صرف ونحو تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، قرآن اور انجیل کے تراجم شامل تھے۔''

جامعہ عثمانیہ حیدرآباددکن

برصغیر میں مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کے پسِ منظر میں جہاں بہت سے نام شخصیات اور اداروں کے ذہن میں آتے ہیں وہاں حیدرآباددکن کی جامعہ عثمانیہ کوفراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام اوراس کی سرپرستی کا فرض نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے ادا کیا۔ لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلامی ریاست حیدرآباددکن کے سماجی ذہنی اور ثقافتی ارتقاء کی آخری اور مکمل کڑی کے طور پر جامعہ عثمانیہ کی حیثیت ابھرتی ہے۔ نہ وہ انفرادی کوشش ہے اور نہ شخصی کارنامہ بلکہ تمام طبقات کے شعور کی بیداری اورآنے والی نسلوں کی ضروریات کا احساس ہے جس نے اس جامعہ کی داغ بیل ڈالی۔

جامعہ کی ابتداء'' کلیہ جامعیہ عثمانیہ'' کے قیام سے ہوئی۔ یہ یونیورسٹی کالج تھا۔ اس کا افتتاح اگست 1919ء میں ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کو اولیت حاصل ہے۔ نواب حیدر یار جنگ معتمد تعلیمات نے کانفرنس کی صدارت 1915ء میں کی۔ اہم ترین موضوع بحث قیام جامعہ تھا۔ خودسر اکبر حیدری نے اس کی تائید کی اور کہا کہ'' خالص مغربی تعلیم ہمارے ملک کے لئے مفید نہیں ہوسکتی۔'' جامعہ عثمانیہ نے مسلمانوں کی تہذیبی اقدار کی جس

انداز میں حفاظت کی اس کے بارے میں عرشیہ شفقت رضوی (75-1974، ص 121) لکھتی ہیں:

> ''طریقہ تعلیم کی دورنگی اور بے اصولی کو مٹانے اور ان خطرناک اور تباہ کن نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقہ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور گھن کی طرح ہمارے نظام تمدّن اور معاشرت، قوائے دماغی اور جسمانی کو اندر ہی اندر کھائے جارہے ہیں...... جو تعلیم عملی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی ساتھ تالیف اور ترجمہ کا کام بھی کرے اور تربیت ذہن اور تحصیل دونوں کے لئے اپنی زبان اُردو کو کام میں لائے۔''

یہ ادارے ہماری تاریخ کے وہ سنگ میل ہیں جو علم وادب اور تعلیم وتہذیب کے دوسو سالہ سفر میں مختلف مراحل پر نمودار ہوئے ہیں۔ ان سے ہمیں اپنے سفر کی سمت متعین کرنے میں مدد ملی ہے اور ہمارے عزم سفر کو بھی ان سے تقویت پہنچی ہے۔ آج ہم آزادی کی جس فضا میں اطمینان اور سکھ کا سانس لے رہے ہیں اور جس آبرومندانہ زندگی نے دنیا کی قوموں میں ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ان میں ان علمی اور ادبی تعلیمی اداروں کی تہذیبی خدمت کا عکس نظر آتا ہے۔ اس طرح مستقبل میں بھی ملک اور قوم کی ترقی کے لئے ان کا وجود ناگزیر ہے۔

باب پنجم

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کا مزاحمتی کردار

مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کی ایک اہم خصوصیت عام اور مفت تعلیم تھی۔ معیار تعلیم بلند تھا اور تعلیمی سہولتیں وافر تھیں۔ ہندوستان میں تعلیم کا بلند معیار زیادہ تر وہاں کے اعلیٰ طریقہ تعلیم کا ہی نتیجہ تھا۔ تعلیم مذہبی فریضہ کا درجہ رکھتی تھی۔ انگریزوں نے جس وقت اس ملک پر قبضہ کیا۔ اُس وقت یہاں کی تعلیمی دنیا پر تاریکی وظلمت کا نہیں، روشنی ونور کا دَوردورہ تھا۔ 1765ء میں شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایک سرکاری فرمان کے ذریعے انگریزوں کے حوالے کردی تھی۔ یہاں سے انگریزوں کی تعلیمی اور سیاسی حکمت عملی کا آغاز ہوتا ہے۔ کمپنی کا راج 1857ء تک رہا۔ جبکہ ملکہ وکٹوریہ نے پورے اختیارات براہ راست خود سنبھال لئے۔ برطانوی حکومت 1947ء تک حکمران رہی۔ کمپنی کے دَور اور برطانوی حکومت کے بلاواسطہ راج کے درمیان تعلیمی نقطہءِ نظر سے کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ ایک تسلسل ہے۔ جس میں کسی قسم کا انقطاع نہیں ہوتا۔ اور گو سیاسی حیثیت سے 1857ء ایک اہم موڑ ہے۔ لیکن انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کے نقطہءِ نظر سے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم اس پورے دَور کو ایک وحدت کی حیثیت سے لیں گے۔ دوسری اہم بات یہ ہے جو نئی تعلیمی پالیسی وضع کی گئی۔ اس کی بنیادیں کمپنی کے دَور میں پڑیں اور ان پر عمل بعد کے اَدوار میں ہوتا رہا۔ اس لئے اصل بنیادوں کا فہم پیدا کرنے کے لئے کمپنی کے دَور کے فکری رُجحانات کو بہ نظر غائر دیکھنا ہوگا۔ اس پورے دَور کے جائزے سے چند اہم اَدوار خود واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

پہلا دَور (1765ء سے 1813ء)

دوسرا دَور (1813ء سے 1854ء)

تیسرا دَور (1854ء سے 1905ء)

چوتھا دَور (1905ء سے 1947ء)

پہلا دَور (1765-----1813) اہل ہند کی سیاسی مغلُوبیت کا دَور ہے کمپنی کا راج آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور جہاں اُسے فوجی اقتدار حاصل نہ تھا، وہاں بھی اس کا سیاسی اثر ونفوذ بڑھ رہا تھا۔ ان حالات میں فطری طور پر کمپنی کے حُکام کو تعلیم کے بارے میں مسلک طے کرنا پڑا۔ جیسے جیسے کمپنی کا اقتدار بڑھتا گیا، عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں اور خصوصیت سے ان کے نئے نئے تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ یہ اِسکول نہ صرف عیسائیوں اور نوآبادکاروں کیلئے کھولے گئے بلکہ غیر عیسائیوں اور ہندوستان کے عام باشندوں کے لئے بھی قائم کئے گئے، لیکن جوں جوں یہ سلسلہ بڑھتا گیا، اہل ہند اور خصوصیت سے مسلمان اس کو تشویش کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور بالآخر مسلمانوں نے اس کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھائی۔ جبکہ ہندوؤں نے بالعموم ان اداروں سے فائدہ اٹھایا۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک اس احتجاجی ردِّ عمل کا یہ اثر ہوا کہ کمپنی کے حُکام کو سیاسی مصالح کی بِنا پر اپنی پالیسی میں ایک نرم گوشہ پیدا کرنا پڑا۔

اس دَور کے جائزے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ کمپنی کے حُکام کسی ایک سخت گیر پالیسی سے مطمئن نہ تھے اور مقامی نظام سے تصادم مول لئے بغیر مغربی تعلیم اور خصوصاً مشنری تعلیم کی سرپرستی کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں اپنے نظامِ تعلیم وتمدّن کو رواج دینا چاہتے تھے۔ غالباً سیاسی مصالح انہیں مجبور کرتے تھے کہ کُھل کر یہاں کے نظام سے ٹکر نہ لیں اور ایسی پالیسی اختیار کریں جس سے یہاں کا تعلیمی نظام سِسک سِسک کر اپنی موت آپ مرجائے اور ایک دوسرا نظام

فطری رفتار کے ساتھ مکمل غلبہ وتسلّط حاصل کرے اور انہیں یہاں کے نظام کوتشدّد کے ساتھ مٹانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ مغربی مؤرخین اس دَور کوتعلیمی غیر جانب داری کا دَور قرار دیتے ہیں۔اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کمپنی نےتعلیم سے غفلت برتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دَور کی پالیسی نہایت ہوشیاری وعیاری سے بنائی گئی تھی۔ مقاصد اسکے بھی وہی تھے لیکن وہ کام کوتدریج وتدبیر کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔پہلے دَور کی انگریزی پالیسی کے متعلق شبیر احمد (1974،ص337) لکھتے ہیں:

''یہ بات ہماری قوت واختیار میں ہے کہ ہم اہل ہند کو بتدریج سب سے پہلے اپنی زبان سکھائیں پھر آہستہ آہستہ ہم اس ذریعہ سے اہل ہند کو اپنے فلسفہ اور بالآخر اپنے مذہب تک لے آئیں گے۔''

دوسرا دَور(1813----1854)سب سے اہم دَور ہے۔اس لئے کہ اس نے نظام کے تفصیلی مقاصد اور مخصوص مزاج کو قائم کیا۔جس میں تعلیمی امور کے بارے میں سب سے زیادہ بحث ومباحثہ ہوا۔حکمران طبقے کی طرف سے اس کے بعد کے اَدوار میں غور وفکر کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے اس دَور میں وہ تعلیمی مسائل کے بارے میں مثبت جدوجہد کرتے نظر نہیں آتے۔مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کے متعلق سیّد نوراللہ(1981،ص75) لکھتے ہیں:

''اس دَور میں مسلمان زندگی اور موت کی اصل لڑائی لڑ رہے تھے اور اپنی ساری قوتیں اس مقصد پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ انگریزوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع ہی نہ دیا جائے اور کسی طرح اپنے اقتدار کو باقی رکھا جائے۔تعلیمی میدان میں یہ زمانہ

مسلمانوں کے لئے زخم کھانے اور چوٹیں سہنے کا زمانہ تھا۔''

تیسرا دَور (1854---1905) میں برطانوی اقتدار پوری طرح مستحکم ہوگیا تھا اور اقتدار بلاواسطہ تاج برطانیہ میں مرکوز ہوگیا تھا۔ سیاسی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں یہ دَور نسبتاً امن وامان کا دَور تھا۔ ہندوؤں نے برطانوی سامراج سے اپنے آپ کو کلی طور پر ہم آہنگ کرلیا تھا۔ مسلمان اس دَور میں سب سے زیادہ نشانہ ءِ ستم بنے اور برطانوی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ اس شجاع اور غیور قوم کو کچل دے۔

تعلیمی حیثیت سے یہ زمانہ جدید تعلیم کی وسعت وفروغ کا زمانہ ہے۔ پرانا نظامِ تعلیم تقریباً ختم ہوگیا اور صرف وہ سخت جان مدرسے رہ گئے جو سیاست، تمدّن اور معاش کی ہر مار کے بعد بھی اپنے مقام سے نہ ہٹے۔ نیا نظام اس زمانہ میں برابر نشوونما پاتا رہا۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان اداروں میں بھی زیادہ اہمیت ثانوی تعلیم کو دی گئی۔ پرائمری تعلیم اس پورے دَور میں عدم توجہی کا شکار رہی۔

قومی نقطہءِ نظر سے اس زمانہ میں ہندوستان میں چند اہم رُجحانات رونما ہوئے جن میں سے ہر ایک کے اثرات تعلیم پر بھی مرتب ہوئے ہندوؤں کا رَدِّعمل یہ تھا کہ انہوں نے نئی تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مسلمانوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں دو متخالف رجحانات رونما ہوئے۔ علماء کرام کے ایک خاص گروہ نے نئی تعلیم کا بائیکاٹ کیا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں انگریزی کی تعلیم تھی کیونکہ محض انگریزی کی تعلیم پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ پروفیسر خورشید احمد (1977، ص79) اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کا اصل اعتراض یہ تھا کہ نئی تعلیم اپنے مزاج، اپنے مقاصد، اپنے نصاب تعلیم اور اپنے اجتماعی ماحول کے اعتبار سے دین اسلام اور اسلامی ثقافت سے کاٹنے اور دُور لے جانے والی چیز تھی۔"

مسلمانوں کا یہ گروہ کوئی انقلابی اقدام کرنے سے اپنے آپ کو معذور پاتا تھا اور صرف اپنے علمی سرمائے کو جس حد تک محفوظ کر سکتا، کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک فاعلانہ نہیں، منفعلانہ ردِّعمل تھا۔ مسلمانوں میں دوسرا ردِّعمل ان کا تھا جنھوں نے نئی تعلیم کو قبول کیا۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ جس حد تک اس میں اسلامیات کی پیوندکاری کر سکیں، لیکن بحیثیت نظام کے نئی تعلیم کو ہی قبول کر لیں۔ یہ ردِّعمل بھی منفعلانہ تھا، لیکن ایک دوسری نوعیت کا، اوّل الذکر گروہ مقاومت کی روش اختیار کئے ہوئے تھا اور آخر الذکر مفاہمت کی۔

چوتھا دَور (1905---1947) تعلیمی نقطۂ نظر سے اس زمانے میں کئی اہم رجحانات نظر آتے ہیں۔ اس دَور کا آغاز لارڈ کرزن کی خالص گوراشاہی سے ہوتا ہے۔ جس میں اس نے تمکنت کے ساتھ محدود تعلیم اور خالص انگریزی تعلیم کے تصوّر کو ازسرِنو پیش کیا۔ اس دَور کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بحیثیت مجموعی طلبہ کا سیاسی کردار بھی ہے۔ اس دَور میں یہ احساس اپنی شدّت کو پہنچ گیا کہ ہندوستان کا نظامِ تعلیم قومی ضروریات کے منافی ہے۔ اور ہر طرف سے اس نظام کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ ہندو اس لئے اس سے غیر مطمئن تھے کہ یہ قومی رنگ سے عاری تھا۔ اور مسلمان اس پر اس حیثیت سے تنقید کر رہے تھے کہ یہ ان کے دین و مذہب اور قومی روایات کو پامال کئے جا رہا ہے۔ یہ دَور دراصل اپنے ماقبل کے بظاہر مستحکم دَور کے مقابلے میں ایک ہیجان اور تغیر کا دَور ہے۔ جس میں اہل ہند بالعموم اور مسلمان بالخصوص اپنی اصل ثقافتی شخصیّت کو بچانے کے لئے بے چین و مضطرب تھے۔ شیخ محمد اکرام (1975، ص 7) لکھتے ہیں:

''یہ دَور ایک شدید بنیادی اور وسیع الاثر کشمکش کا دَور تھا جس کا اختتام ابھی نظر نہیں آتا اور مجموعی طور پر سیاسی محکومی اور نا مساعد حالات کے باوجود، اس زمانے کے ٹھوس، تعمیری کارناموں سے طبیعت کو فرحت ہوتی ہے۔''

تعلیم کا جو خول ان کے گرد بنا دیا گیا تھا۔ اس سے وہ اپنے آپ کو نجات دلانا چاہتے تھے اور وہ نئی راہیں اختیار کرنا چاہتے تھے جو تعلیم کو ان کی تاریخی ضرورتوں سے ہم کنار کرسکیں۔ لیکن اس کی حیثیت ایک خواہش اور ایک خواب کی ضرور تھی، ایک حقیقت کی نہیں۔ اس احساس کا نتیجہ ضرور ہوا کہ مجبورانہ نقالی اور جھوٹے اطمینان کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ ایک نئے اضطراب نے لے لی۔

مزاحمت کی اہمیت

جہاں تک تاریخی عمل کا تعلق ہے کسی بھی معاشرے میں ترقی بغیر کسی رکاوٹ کے نہیں ہوتی، یہ نہیں ہوتا کہ معاشرہ بغیر مزاحمت کے آگے کی جانب بڑھتا چلا جائے، ترقی ہمیشہ تصادم کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ اس کو قدیم وجدید کی کشمکش کہا جائے یا خیر وشر اور نیکی وبدی کی جنگ کہا جائے۔ اس تصادم کی وجہ سے معاشرے کی ترقی خمدار اور پیچ در پیچ لائنوں کے درمیان سے گزر کر ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے انگریزوں کی سیاسی حیثیت کو مستحکم اور پختہ تر ہونے سے روکنے کیلئے مزاحمتی پہلو اختیار کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی (1986 الف، ص ص 145-144) لکھتے ہیں:

''معاشرہ میں ایک عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے اور روایات اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد سے تعمیر ہوتی ہیں اس لئے اگر کسی مرحلہ پر رجعت پسند طاقتیں کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ

نہیں کہ وقت کا دھارا اُن کے ساتھ ہے یہ تاریخ کا ایک گزرتا
ہوا لمحہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ بہت جلد ان کو ترقی پسند طاقتوں کے
آگے پسپا ہونا پڑتا ہے۔''

تعلیم قوم کی حیات و بقا کے لئے لازمی ہے ۔قومیں اس کی بدولت اُبھرتی اور ترقی کرتی ہیں۔انسان کی یہ تمام تر ترقی اس کے ماضی کی تعلیم میں مضمر ہے۔ ماضی کی تعلیم کو فراموش کر دینے کے بعد نہ ہم حال کی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں اور نہ مستقبل کے بارے میں تعلیم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔مسلمان اپنی دینی تعلیم کے فروغ میں ماضی کی تعلیم کو فراموش نہیں کر سکتے تھے ۔اِس حوالے سے ظفر حسین خان (1980، ص 14) رقمطراز ہیں:

''ہم ماضی کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اٹھا کر اس طرح نہیں
پھینک سکتے جس طرح ایک مزدور اپنے بوجھ کو پھینک دیتا ہے
کیوں کہ اس کا اثر ہمارے رگ و پے اور قلب و دماغ میں
خون کی طرح سرایت کر چکا ہے۔''

ہندوستان میں جب برطانوی اقتدار قائم ہوا اور مسلمان حکمران طبقہ کو مکمل شکست ہوگئی، تو احساسِ شکست نے ، انہیں زبردست احساس کمتری میں مبتلا کر دیا کیونکہ نہ تو وہ برطانوی طاقت کا عسکری لحاظ سے کوئی مقابلہ کر سکے اور نہ ہی ان کی تہذیبی اور ثقافتی روایات، اقدار اور ادارے اُن کے آگے ٹھہر سکے۔ یہ ایک ایسی شکست و پسپائی تھی کہ جس نے منجمد معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔اس لئے اس کا ردِّ عمل کئی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ان کی نشاندہی ڈاکٹر مبارک علی (1986 ب، ص 284) کرتے ہیں:

''اوّل عملی زندگی سے فرار اور مذہب وتصوف میں پناہ، دوم، برطانوی اقتدار کی مخالفت اور مزاحمت، سوم، انگریزوں کی ہر چیز سے نفرت اور اپنے ماضی کی روایات پر فخر۔''

انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اُن کے مشترک تہذیبی ورثہ سے کاٹ دینے کی کوشش کی اور وہ اِس میں کامیاب رہے، تہذیبی ورثہ سے کٹ جانا جدید ماہرین تعلیم کے نزدیک ناقابل تلافی نقصان کا حامل ہے۔ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے منفی اثرات کے نفوذ کا سدِّ باب بذریعہ مزاحمت کیا۔ اس حوالے سے شبیر احمد (1974، ص 454) رقمطراز ہیں:

''انسان اپنے ماضی سے اِس طرح وابستہ ہے کہ اِس کا اپنے تہذیبی ورثہ سے کٹ جانا، اس تہذیب کے تباہ ہو جانے کے مترادف ہوگا۔''

مغربی تعلیم خدا پرستی سے خالی ہے۔ اس میں جو نوجوان نسل پرورش پا رہی ہے اِن میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی و جفاکشی، نہ ضبط اوقات، نہ صبر، نہ عزم واستقلال ہے، نہ باقاعدگی وباضابطگی اور نہ ضبطِ نفس ہے اور نہ ہی اپنی ذات سے کسی بالاتر ذات سے وفاداری۔ ان کی حالت ایک خودرَو درخت کی طرح ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو اس غیر منضبط آزادی کی روش سے دُور رکھنے کے لئے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (1963، ص 170) لکھتے ہیں:

''اِسلام محض ایک نظریے کا نام نہیں بلکہ اس کے نزدیک بلند سیرت وکردار کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مسلمانوں نے طلبا میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کہ اِسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے وہ بھی اُن کی مذمت کریں اور جن اوصاف کو اِسلام

مقصود اور مطلوب قرار دیتا ہے، وہ اُن کو خود پسند کریں اور
اپنے اندر اُن کی نشو ونما کریں۔''

مزاحمت کی ماہیت

انگریزی تہذیب اپنے اوج کمال پر تھی اور یہاں غلامانہ ذہنیت اپنے شباب پر۔ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے زندگی کا معیاری تصوّر مغربی زندگی تھا اور ہر دائرہ کار میں اس کی نقالی کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس نئی روش کو پیدا کرنے میں مغربی تعلیم کا فیصلہ کن حصہ تھا اور جس بناء پر مسلمان مغربی تعلیم کے مخالف تھے۔ اس مزاحمت کی نوعیت تعلیم، مذہب اور تہذیب کے میدان میں نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کے دینی تعلیمی اداروں، علوم شرقی کے اداروں، اُردو ذریعہ تعلیم کے اداروں، تعلیمی اور ادبی انجمنوں، فنی تعلیم کے اداروں اور قدیم وجدید کے جامع اداروں نے مزاحمتی کردار اپنے اپنے طور پر ادا کر کے مزاحمت کی ماہیت کو مثبت اور منفی طور پر اُجاگر کیا۔ ان میں سے ہر رجحان کے نمائندے ادارے کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

دارالعلوم علی گڑھ ــــــ انگریزوں سے مفاہمت کی مثال

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد حالات میں ایک نئی تبدیلی آچکی تھی۔ مسلمانوں میں ایک نیا مکتب فکر پیدا ہو چکا تھا جس کا خیال یہ تھا کہ مسلمان بحیثیت قوم معاشرہ سے یا حکومت وقت سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ انہیں لازماً ملکی زندگی میں عملی حصہ لینا چاہئیے۔ ملکی درسگاہوں میں شریک ہونا چاہئیے اور مغربی علوم کی تحصیل کرنا چاہئیے۔ کوئی زندہ قوم دنیاوی علوم سے جاہل نہیں رہ سکتی۔ آج کے دَور میں مغربی علوم ہی دنیاوی علوم ہیں۔

اس مکتبہ فکر کے حضرات نے صورت حال پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ مسلمان اپنے آپ

کو انگریزوں سے لڑ کر نہیں ، بلکہ مِل کر بچا سکتے ہیں ۔ اُن کے لئے سیدّھا راستہ یہ ہے کہ وہ انگریزوں سے وفاداری کا تعلق قائم کریں ۔انگریزی تعلیم حاصل کریں اور مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ انگریزوں سے خوشگوار روابط قائم کریں اوران کی حکومت سے جو فوائد حاصل ہوسکتے ہیں ان سے پوری طرح اور صحیح طور پر کام لے کر اپنی قوم کی اصلاح وترقی کے لئے کوششیں کریں ۔ کیونکہ موجودہ حالت میں اس قوم کے لئے یہی سب سے اہم مسئلہ ہے۔

قومی زوال وادبار کے اس نازک دَور میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سرسیّد احمد خان جیسا عظیم مصلح اور رہنما مل گیا۔جن کی کوششوں نے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلمانوں کو بچالیا۔قوم کی بھلائی کے لئے یہی تڑپ اور سچی محبت تھی ۔جس نے سرسیّد کو معاشرہ کی اصلاح وترقی کی جدوجہد پر آمادہ کیا ۔اورانہوں نے جدید علوم کی اشاعت ، دینی عقائد اور اخلاق وعادات کی دُرستی ، رسوم ورواج اور طرزِ معاشرت کی اصلاح وترقی ۔مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اتحاد وتعاون ، مذہبی رواداری اور حقوق وفرائض کا تحفظ واحترام جیسے اہم امور پر توجہ کرکے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کو ایک ایسی منظّم اور کامیاب تحریک بنادیا جس نے مسلمانانِ ہند کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا۔

سرسیّد تحریک ، بظاہر مفاہمت کی تحریک محسوس ہوتی ہے لیکن بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ایک حقیقی مؤرخ کی حیثیت سے اس تحریک کا سب سے اہم پہلو مزاحمتی نوعیت کا ہے۔سرسیّد کو انگریز سے نہ تو محبت تھی اور نہ ہی وہ انگریزی کلچر کے دلدادہ تھے ،وہ اگر فرنگی کی زبان اور ثقافت کی حمایت کرتے تھے،تو اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز کے تمدّن سے براہ راست واقف اوراس کی کمزوریوں سے آگاہ ہوکر ہی ہم اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں ۔ اس حوالے سے سیّد اصغر علی شاہ جعفری (1983،ص62) لکھتے ہیں:

''جب تک انگریز کی اصلیت ہمارے سامنے حقیقی انداز میں
نہیں آتی ، اُس وقت تک اس رنگین صورت والے گھس کر بیٹھنے
والوں کو ہند سے نکالنا آسان نہیں۔''

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سر سیّد احمد خان نے مسلم قوم کو مختلف زاویوں سے تیار کرنا شروع کر دیا اور اس طرح ہندو کے تعصّب کے زور کو توڑنے کے لئے مدلل تقریریں شروع کر دیں اور ادبی، علمی اور معاشرتی زاویوں سے جدو جہد شروع کر دی۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سر سیّد احمد خان نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ جب تک مسلمان قوم، فاتح قوم کی زبان، تہذیب وثقافت اور تعلیم کو اچھی طرح سمجھ نہ لے گی اور ضرورت کے مطابق اختیار نہ کرے گی کامیابی کا راستہ عنقا ہے۔ اسلئے جدیدیت پر تمام نظر مرکوز کر دی۔ سر سیّد احمد خان کے جدید انگریزی تعلیم کے نظریے سے متعلق مشہور نقاد اور مبصّر ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم (1960، ص250) نے لکھا ہے:

''ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ قوم کو اس ورطہ مذلّت سے کیونکر
نکالا جائے۔ بہت غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا
علاج صرف تعلیم ہے۔ اور تعلیم بھی جدید۔ یہ ساری آفت ،
مصیبت پس ماندگی اور محرومی، تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے وہ
دنیا کے حالات سے بے خبر اور ترقی کی جدید راہوں سے
ناواقف ہیں۔''

''انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس'' کے عنوان سے انگریزی تعلیم کی ضرورت کے بارے میں علامہ شبلی کے نظریہ کو علامہ سیّد سلیمان ندوی (سن ندارد، ص133) نقل کرتے ہیں:

''علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر الم نشرح ہوگئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انہوں نے خود شروع کر دیا۔ علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک سکول جاری کریں۔''

سرسیّد کے زمانے میں نہ صرف تعلیمی ترقی بلکہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بھی انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کی بڑی ضرورت تھی۔ ہندوؤں نے اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر تھے۔ سرسیّد چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھنے اور اسکی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ کریں۔ اس کی ترغیب دلانے کے لئے سرسیّد احمد خان (1870، ص 133) نے یہ استدلال پیش کیا:

''جس زمانے میں جس قوم کی حکومت ہوتی ہے اس زمانے میں اسی کی زبان اختیار کی جاتی ہے اور جس ملک میں جو زبان حکومت کی ہوتی ہے اس ملک میں اسی زبان کا عروج ہوتا ہے اور لوگ اسی کو اختیار کرتے ہیں اب ہندوستان میں انگریز کی حکومت ہے جس کی زبان انگریزی ہے۔ اور اسی زبان کو عروج ہے۔ لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کوتاہی کی ہے۔ جو بڑی غلطی ہے۔''

سرسیّد نے جب یہ حالت دیکھی تو انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ اور کہا کہ دُنیاوی تعلیم ایسی ہونی چاہئے جس سے کچھ دنیا کا کام چلے۔ پس ہم وہ دُنیاوی علوم اپنی

تعلیم میں داخل کریں جو درحقیقت دنیا کے کام کے ہیں۔ اگر ہم صرف یہی مقصد رکھیں کہ وہی پرانا فلسفہ ہیئت اور منطق پڑھادیں اور علموں سے کچھ سروکار نہ رکھیں جو آج ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں تو ہم درحقیقت اپنی قوم کے ساتھ کچھ بھلائی نہیں کریں گے۔ اپنے اس خیال کو سرسیّد نے زیادہ واضح طور پر گورکھ پور میں تقریر کرتے ہوئے ظاہر کیا۔ سرسیّد احمد خان کے الفاظ کو مولانا الطاف حسین حالی (1966، ص125) نے اِس طرح لکھا ہے:

> ''پس ہم کو بڑی مضبوطی سے ارادہ کرنا چاہیئے کہ جس قدر علوم دنیاوی تعلیم سے متعلق ہیں مثلاً الجبرا، زوالوجی، جیالوجی، لاجک، مارل فلاسفی، کیمسٹری اور تمام علوم جو ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں، بڑے اہتمام سے اور کامل طور سے تعلیم دیں۔''

سرسیّد کی ذات عظیم تہذیبی کارناموں کا سرچشمہ تھی۔ علم وادب کا میدان ہو یا تعلیم وتربیت کی جولان گاہ سیاست ومعیشت کی راہیں ہوں یا الٰہیات واخلاقیات کے راستے ہر جگہ سرسیّد کا اشہب کردار، دادِ سُبک سیری دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ سرسیّد کی ذات انجمن در انجمن کی مثال تھی۔ سرسیّد کی سجائی ہوئی تعلیمی محفلوں میں سے ایک علی گڑھ کالج کا قیام ہے۔ جب جنوری 1877ء کو علی گڑھ کالج کا سنگِ بنیاد لارڈ لٹن وائسرائے ہند کے ہاتھوں نصب کرایا تو سیّد محمود نے سپانامہ پڑھا جس کے الفاظ مختار مسعود (1973، ص26) لکھتے ہیں:

> ''یہ ملک بھر میں پہلا ادارہ ہے جو مسلمان ایک علیحدہ طبقے کی حیثیت سے اپنی انفرادی ضرورت اور متحدہ خواہش کے تحت قائم کررہے ہیں اور اس مدرسے کی بنیادیں تاریخ کے ان تقاضوں میں ملیں گی جن سے یہ ملک پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا۔''

سرسیّد احمد خان تعلیمی میدان میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ مسلمانوں میں ایک نئی امید اور نیا جوش پیدا ہوا اور ان میں اپنے مسائل خود حل کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے انہیں ایک قوم بنا دیا۔ انہوں نے معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے سماجی و معاشرتی اور تعلیمی سوسائٹیاں قائم کیں اور علی گڑھ میں کالج جاری کیا۔ اس کالج کے فوائد سے متعلق سیّد ہاشمی فرید آبادی (1990، ص154) رقمطراز ہیں:

> ''علی گڑھ کالج کے قیام سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کا راستہ مسلمانوں پر کُھل گیا، ایک طرف علی گڑھ سے بی۔اے، ایم۔اے، ایل ایل بی ہو کر نکلنے لگے۔ دوسری طرف بنگال و بہار کے سرکاری کالجوں میں پہلے خال خال طلبہ داخل ہوتے تھے۔ اب وہاں اور دوسرے صوبوں میں ان کی تعداد بڑھنے لگی بیسیوں ثانوی مدارس اور چند کالج خود مسلمانوں کے روپے اور انتظام سے کُھل گئے۔''

مہذّب قوم کی پیروی کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں سرسیّد کا یہ بنیادی اصول تھا کہ مہذّب قوموں کی خوبیوں اور ترقی وکمال سے استفادہ کیا جائے۔ انہوں نے معاشری اصلاح کی تحریک شروع کی اور ایک خاکہ مرتب کیا اور اُنتیس امور کی اصلاح پر مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ اِن امور کی فہرست شاہد حسین رزاقی (1963، ص39) نے پیش کی ہے:

> ''آزادی رائے، درستی عقائد مذہبی، خیالات و افعال مذہبی، تدقیق بعض مسائل مذہبی، تصحیح بعض مسائل مذہبی، تعلیمِ اطفال، سامانِ تعلیم، عورتوں کی تعلیم، ہنر وفن، عزت اور غیرت، ضبطِ اوقات، اخلاق، صدقِ مقال، دوستوں سے رسم

وراہ، کلام، لہجہ، طریقِ زندگی، صفائی، طرزِ لباس، طریقِ
اَکل وشرب، تدبیرمنزل، کثرتِ ازدواج، غلامی، رسومات
شادی وغمی، زراعت، واسطے تہذیب وشائستگی حاصل کرنے
کے ہوگا۔''

سرسیّد نے معاشری اصلاح کے منصوبہ کوعملی شکل دینے کے لئے ایک رسالہ جاری کرنا تجویز کیا اور ''تہذیب الاخلاق'' اُس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں ''محمڈن سوشل رفارمر'' رکھ لیا۔ تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے بارے میں عشرت رحمانی (سن ندارد، ص 105) لکھتے ہیں:

''اس رسالے کی اشاعت سے اُن کا اصل مقصد مسلمانوں کی
دینی واخلاقی اور معاشرتی اصلاح تھا۔ جوشروع سے آخر تک
جاری رہا۔''

رسالہ تہذیب الاخلاق کی افادیت واہمیت کے بارے میں محمد امین زبیری (1934، ص 450) رقمطراز ہیں:

''اس رسالہ سے صرف علم وادب اور انشاہی میں ترقی نہیں
ہوئی بلکہ اخلاق اور عادت وخصلت کو بھی کچھ ترقی ہوئی۔ نیکی
کے برتاؤ میں خود انسان کی اپنی ذات سے اور اپنے خویش اور
اقربا، دوست، آشنا، بیگانہ ویگانہ سے علاقہ رکھتی ہے، نہایت
اعلیٰ درجہ کی تہذیب حاصل ہوئی اور خود تہذیب وشائستگی کی

ایسی عمدہ صیقل ہوئی جس کی آج تک کوئی نظیر نہیں۔''

علی گڑھ تحریک نے اُردو ادب کو بے حد ترقی دی اور اُردو کو مسلمانانِ ہند کی مشترکہ قومی زبان بنا دیا۔ جدید اُردو ادبیات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ سرسیّد اور اُن کے رفقاء نے مسجع اور مقفیٰ اُردو نثر کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئے طرزِ تحریر کو رائج کیا، جو اظہارِ مطلب کے لئے مفید اور سمجھنے میں آسان تھا۔ مولانا علامہ شبلی نعمانی (1955، ص 115) اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''سرسیّد کے جس قدر کارنامے ہیں، اگرچہ ان میں ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت سے ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسیّد ہی کی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی، صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد فارسی زبان کو یہ بات آج تک نصیب نہیں۔''

جب سرسیّد علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس پہنچے تو بنارس والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی، کہ شاید ان کی ہندی خطرے میں پڑ گئی، حفظِ ماتقدم کے طور پر انہوں نے پہلے سے ہی ایک سکیم تیار کر لی، جس کے تحت ''اُردو'' کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک شروع ہو گئی۔ چنانچہ بنارس کے چند ایک شرانگیز افراد کی وساطت سے اُردو کے خلاف تحریک چلا دی۔ اس واقعہ سے پیشتر سرسیّد کا خیال تھا، کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی اشتراک کے ساتھ کسی خاص منزل تک بہ آسانی اور جلدی لے جا سکیں گے، لیکن ان کا یہ خیال بالکل مایوسی میں تبدیل ہو گیا اور اُردو کے تحفظ و بقا کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس بارے میں شمائل احمد شمیم (74-1973، ص 138) لکھتے ہیں:

> ''سر سیّد احمد خان آخری ایّام تک اس کے لئے کوشش کرتے رہے۔ ان کے جانشین محسن الملک، وقار الملک اُردو کی توسیع واشاعت کے لئے سرگرم عمل رہے یہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صوبہ بمبئی میں اُردو سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔''

برصغیر میں عوام اور مسلمان خاص طور پر انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر جدید علوم وافکار سے بے بہرہ تھے۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ یا تو وہ انگریزی زبان سے اپنی ناواقفیت کو ختم کریں یا اُن کے لئے مختلف علوم وفنون اور افکار تازہ کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا جائے چنانچہ 9 جنوری 1864ء کو غازی پور میں سر سیّد اور اُن کے ایک انگریز دوست لیفٹیننٹ کرنل گریہم نے سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ سوسائٹی کی خدمات کے حوالے سے پروفیسر عصمت اللہ خان (1974، ص 171) لکھتے ہیں:

> ''سوسائٹی کے زیر انتظام تاریخ اور مختلف علوم وفنون پر جتنی کتابیں ترجمہ ہوئیں اُن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اس سلسلے میں رولن کی تاریخ مصر و یونان دو جلدوں میں ترجمہ کی گئی۔ تاریخ چین، تاریخ ہند، تاریخ ایران، تزکِ جہانگیری بھی اُردو میں منتقل ہوئیں۔''

سر سیّد نے جس تحریک کی رہنمائی کی، اس کے کئی پہلو تھے۔ تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی۔ سر سیّد احمد خان علی گڑھ کو مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی بنانا چاہتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کی خدمات کے حوالے سے شیخ محمد اکرام (1975، ص 140) لکھتے ہیں:

''سرسیّد کی نسبت سچائی سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں
نے نہ صرف مسلمانوں کے تنزل کو روک لیا بلکہ ایک پشت
(Generation) کے اندر انہیں پھر سے ایک جلیل القدر
اہمیت اور غیر مشتبہ اثر کا مرتبہ دے دیا۔''

علی گڑھ کے تاریخی کردار پر بے لاگ تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ناقدین کا خیال ہے کہ علی گڑھ کے قیام اور اُس کے ارتقاء میں تخلیقی فکر کے مقابلے میں تقلیدی فکر نمایاں نظر آتی ہے جس کے بارے میں شیخ محمد اکرام (1975، ص243) لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کے دو متضاد عناصر کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش
کی، یعنی مغربی تہذیب اور اسلام۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ
مغربی تہذیب میں ہی مسلمانوں کو مہارت حاصل ہوئی اور نہ
اسلام ہی پورے طور پر ان کو حاصل ہوا۔ اور قوم میں وہ سب
سے بڑا روگ پیدا ہوا جسے ہم تضاد اور تناقض سے تعبیر کر سکتے
ہیں۔''

علی گڑھ نے دینیات کے ایک پیریڈ کو اسلامی تعلیم کے مترادف قرار دے کر اسلامی تصورِ تعلیم کو ختم کر دیا اس قسم کے تجربات سے اہلِ نظر پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ مغربی علوم کی درسگاہوں میں اسلامی دینیات کی پیوند کاری سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے۔ اس سوچ پر پروفیسر سیّد محمد سلیم (1980، ص278) رقمطراز ہیں.

''عصری علوم کے غلبہ اور درسگاہوں میں مغربی ماحول کے
ہجوم میں دینیات کا ننھا پودا مرجھا کر رہ جاتا ہے۔ اس سے یہ
توقع قائم کرنا کہ یہ اسلامی ذہن کی آبیاری کرے گا ایک
فضول سی توقع ہے''

سرسیّد نے یہ رائے قائم کی تھی کہ فرد کو اپنے اعتقادات ونظریات کے مطابق تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ہر تعلیمی ادارے کو چاہیے کہ وہ تعلیم تمام طلبہ کی ضرورت اور جس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہوں اس کے مطابق مذہبی تعلیم مہیا کرے۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہر مکتبہ فکر کے اساتذہ ادارے میں موجود ہوں۔سرسیّد احمد خان کی اس رائے کے متعلق ایس۔ایم شاہد (1984،ص19) لکھتے ہیں:

> ''سرسیّد دو قسم کی تعلیم پر یقین رکھتے تھے ایک مذہبی تعلیم دوسری سکول تعلیم جس میں مہذب کو عمل دخل نہ ہو اور مذہبی تعلیم کو عام تعلیم کے ساتھ اتنا مدغم ہونا چاہیے کہ وہ اس سے علیحدہ نہ کی جاسکے اور مسلمانوں کو دونوں عام تعلیم اور مذہبی تعلیم حاصل کرنی چاہیے لیکن مذہبی تعلیم مکتبہء فکر کے مطابق ہونی چاہیے''

علی گڑھ کے ادارے میں اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ رکھے جائیں جس کا اصل مقصد تو شائد انگریزوں کو اپنی وفاداری اور غیر مضرت رسانی کا ثبوت دینا تھا لیکن عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اساتذہ کی گرفت کالج پر مضبوط ہوتی گئی اور مغربیت کی رو طلبہ میں تیزی سے سرایت کرتی چلی گئی۔انگریز سٹاف کے بارے میں شبیر احمد(1974،ص431) لکھتے ہیں:

> ''سیّد احمد خان اپنے مدرسۃ العلوم میں انگریز پرنسپل اور انگریز پروفیسر رکھنے کے بڑے قائل تھے چونکہ ان کی مادری زبان انگریزی تھی اس لئے اُن کی تعلیم سے طلبا انگریزی اچھی سیکھ لیتے تھے ،جس سے معاشرہ میں اور خصوصاً سرکاری دفتروں میں ان کی قدر زیادہ ہوتی تھی، اس کے علاوہ انگریز اساتذہ

کے اثر سے حکومت سے امداد بھی اچھی مل جاتی تھی۔''

سرسیّد احمد خان نے اپنے کالج کے ذریعے مسلمانوں کو جو تعلیم دینی شروع کی اس میں ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ صرف وہی بچے حاصل کر سکتے تھے جو فیس ادا کر سکیں۔ یہ خرابی بھی دراصل نظام تعلیم ہی کی خرابی تھی یہ نظام صرف تھوڑے سے لوگوں کو معمولی قسم کی تعلیم دینے کے لئے قائم کیا تھا اور اس تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے ایک ضروری شرط یہ تھی کہ بچے فیس ادا کریں۔ اس کے جواب میں شبیر احمد (1974، ص430) تحریر کرتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ علی گڑھ ادارہ رہائشی تھا۔ اس میں قیام وطعام پر خرچ آتا تھا اس لئے اخراجات بھی دوسرے اداروں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ لیکن غریب اور ذہین طلبا کے لئے بہت سے وظائف کے انتظامات کئے گئے تھے، لیکن وہ کتنے بھی ہوتے اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے تھے جو مسلمانوں کے من حیث القوم افلاس نے پیدا کر دیا تھا۔''

دینی تعلیم کے سلسلے میں سرسیّد احمد خان نے ایک نیا نقطۂ نظر اختیار کیا اور اس کے لئے طریقہ کار بھی نیا اختیار کیا۔ اعتقادی اور دینی امور سے زیادہ ان کے یہاں مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو اہمیت حاصل ہے۔ نصابِ تعلیم میں وہ دین کی معتدل مقدار ہی گوارا کرتے تھے۔ نصابِ تعلیم کمیٹی کو ہدایت دیتے وقت جو الفاظ سرسیّد نے خود کہے تھے ان کا تذکرہ سیّد افتخار عالم (1975، ص133) کرتے ہیں:

''مگر مذہبی کورس کو ایسی معتدل مقدار پر قرار دینا ضروری ہوگا جس سے دیگر علوم کی تعلیم میں حرج نہ پڑے۔''

ایک طبقہ جو اُن کے خیالات اور خاص طور پر مذہبی خیالات کو ناپسند کرتا تھا وہ سرسیّد کی زندگی میں بھی ان پر سخت تنقید کرتا تھا، بلکہ ان کو کافر، نیچری، اور مُلحد لکھنے سے بھی گریز و پرہیز نہ کرتا

تھا۔سرسیّد کواس بات کا احساس تھا کہ برصغیر میں بہت سے مذاہب کے لوگ اور ہر مذہب کے لوگوں کے اعتقادات اور نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہر فرقہ کے لوگوں کوایک ہی طرز کی مذہبی تعلیم دی جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ سرسیّد کسی مذہبی فرقہ میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے''اس سلسلے میں سرسیّد احمد خان (1870،ص100) لکھتے ہیں:

''جو لوگ ہندوستان میں مسلمانوں کی عام تعلیم پر کوشش کرتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ عام تعلیم کا رواج کس قسم کے زن و مرد میں بغیر شمول مذہبی تعلیم کے نہ ہو اور نہ ہوگا اور نہ دنیا میں کوئی ملک اور قوم موجود ہے جس میں عام تعلیم کا رواج بلاشمول مذہبی تعلیم کے ہوا ہو۔''

اکبر کا نظریہ تعلیم اِن مفکرین سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ قدرے تہذیبی بھی ہے وہ مغربی تعلیم کا حصول اپنی تہذیب ومعاشرت کی بنیادوں پر چاہتے ہیں اکبر تعلیم جدید کے زبردست نقاد تھے اور اس سلسلے میں سرسیّد کی تعلیمی پالیسی پر تنقید بھی جا بجا اُن کے کلام میں ملتی ہے علی گڑھ پر تنقید کی وجہ ایس۔ایم۔شاہد (1984،ص56) بیان کرتے ہیں:

''اکبر نے خود چھ سال علی گڑھ میں رہ کر قریب سے اس نظام تعلیم کا جائزہ لیا اور فکر وانہاک کے بعد ٹھوس نتائج اخذ کیے اور قوم کو آگاہ کیا کہ اس عرصہ میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہماری نہ کوئی منزل رہی اور نہ خود ہی بلکہ نئی تعلیم کی بدولت شیخ ومسجد سے ہمارا تعلق منقطع ہوگیا۔''

انگریز نے اس ملک میں خاص طرح کا نظام رائج کر کے مدرسوں اور کالجوں کو کلرک بنانے کے کارخانے بنادیا اور اس طرح اس کا کاروباری اور سرکاری مقصد پورا ہوگیا۔اس کا اظہار ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (1966،ص115) اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''حصولِ تعلیم کے بعد سرکاری نوکری کی تلاش ایسی ذہنیت اور روایت بن چلی تھی جو مصلحین قوم کے نزدیک بھی خوش آئند نہ تھی کیونکہ ان کا مقصد بھی یہ نہ تھا کہ قوم کا ہر تعلیم یافتہ فرد سرکاری مشینری کا ایک حقیر پرزہ بن جائے۔''

اکبر الہ آبادی عقیدوں میں پکے اور رائے میں دیانتدار تھے سرسیّد کی وفات سے پہلے انہیں علی گڑھ کے معاملات میں جو اختلاف پیدا ہوا۔ وہ سبھی کو معلوم ہے۔ انہیں نئی تعلیم اور علی گڑھ والوں سے جو مایوسی ہوئی، اس کا بھی انہوں نے برملا اظہار کیا۔ تعلیم قدیم کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ تعلیم جدید کی کمزوریوں اور نتائج کا اُنہوں نے موثر انداز میں تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ (1989، ص319) بحوالہ اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

''اِس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ زمانہ اور مغربی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی نے ہم مسلمانوں میں ایک نئی بیماری پیدا کر دی ہے۔ جو تعصّب، جہل اور تقلید سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ اور جس کا نام آزادی ہے۔ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب اور یورپین خیالات سے پہلے مسلمانوں کی حالت دُنیاوی اعتبار سے گو خراب تھی اور علم و دولت، شائستگی اور عزت کے لحاظ سے گو وہ بہت ذلیل حالت میں تھے مگر اسلام باقی تھا ۔۔۔۔۔۔ کیا فائدہ ہو گا مسلمانوں کو اگر اُنہوں نے ابو حنیفہؒ اور شافعی کی تقلید چھوڑ دی اور بے سمجھے ڈارون اور بریڈلا کے پیرو ہو گئے۔''

تعلیم نو کے نقیب اس خام خیالی میں تھے کہ اس طریقہ تعلیم سے قوم ترقی کرے گی۔ مگر ترقی تو ایک طرف وہ اعلیٰ اقدار جن کی بدولت مشرق مغرب سے بازی لے گیا تھا۔ اس سے بھی ہاتھ دھو

بیٹھے۔مغرب کی نقالی میں لباس کی نئی تراش خراش، رہن سہن اور فیشن پرستی تو قوم کے نونہالوں کو آ گئی مگر وہ زندہ قوموں کی خصوصیت سے عاری ہو گئے مغرب کی نقالی اکبر کو ناپسند تھی۔ایک ناصح کی طرح اکبرالہ آبادی نئی تعلیم کی اندھی تقلید سے منع فرماتے ہیں جس کا تذکرہ ایس۔ایم۔شاہد (1984،ص62) کرتے ہیں:

''اس نئی تعلیم نے نئی نسل کو خاصا بے راہ رَو کر دیا اور وہ نقلِ انگریز کو تہذیبِ ترقی اور شائستگی کے نام سے موسوم کرنے لگی قوم کے قلب ونظر پر بھی مغربی روش کا سایہ پڑنے لگا۔اپنے طرز معاشرت کی جگہ انگریزی طرز کو اپنانے لگی۔''

سرسیّد کو اپنی تعلیمی پالیسی کامیاب بنانے کے لئے مسلمان علماء اور مذہب پسند حلقوں کی طرف سے جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سرسیّد احمد خان اپنے زمانے کی ایک متنازعہ شخصیت تھے اور اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ انگریزی تعلیم کے حامی تھے۔بقول عبدالسلام چوہدری (1996،ص89):

''علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتوئ میں بھی یہ نہیں لکھا گیا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسیّد جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو شخص ایسا مدرسہ قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں۔''

سرسیّد نے مسلمانوں کو اُس ہاری ہوئی فوج کی مانند سمجھا جس کے لئے سب سے صحیح حکمت عملی محض اُس کو بچالینا ہے، خواہ اُس کو بچانے میں عزت وغیرت کی کتنی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔علی گڑھ کے اس تاریخی کردار کے حوالے سے پروفیسر خورشید احمد (1977،ص86) رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے تعلقات انگریزوں سے
استوار کرائے ، بے اعتمادی کی فضا دُور کی، انگریزوں کی
غلط فہمیوں کو دور کیا، کچھ سیاسی رشوت دی، کچھ دم خم مسلمانوں
کے ختم کیے، اُن میں تسلیم کی خُو ڈالی اور اِسطرح جو ایک
دوسرے کے خون کے پیاسے تھے کم از کم تھوڑی دور ہاتھ میں
ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔''

سر سیّد کے بارے میں جو حضرات انگریزوں کا خوشامدی کہہ کر بدنام کرتے رہے ہیں ان کے دعوؤں کے ثبوت میں کئی تاریخی شہادتیں سامنے آچکی ہیں ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانوں سے سوال کیا کہ' اگر ہندوستان کے ملک پر ایسے زمانہ میں جبکہ یہاں انگریزوں کی حکومت ہے' کوئی بیرونی اسلامی ملک حملہ کر دے تو ہندوستان کے مسلمان ایسی حالت میں ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دیں گے۔ اپنی حکومت کا یا بیرونی مسلم ملک کا؟ کسی عالم دین نے اس کا جواب نہ دیا اور خاموش رہے۔ انگریزی حکومت کے خوف سے مناسب فیصلہ نہ کر سکے۔ لیکن سر سیّد نے اس کا جواب دیا۔
سر سیّد کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے عشرت رحمانی (سن ندارد ، ص 113) لکھتے ہیں۔

''فی الحال ہم یہ فیصلہ کر کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمان
ایسے وقت میں کیا کریں گے البتہ یہ کہا کہ مسلمان وہی کریں
گے جو وقت کی ضرورت اور اُن کے مذہب کا تقاضا ہوگا۔''

سر سیّد نے مراد آباد کے قیام میں 1859ء میں ایک کتاب اسباب بغاوت ہند کے نام سے لکھی۔ اس میں سر سیّد نے 1857ء کے خونچکاں واقعات و حالات اور جو اسباب آزادی کے محرک تھے اُن کو تفصیل سے لکھ کر انگریزوں کو متوجہ کیا جس وقت سر سیّد نے ان حالات کو قلمبند کیا تو اُن کے دوست رائے شنکر داس منصف مراد آباد نے سر سیّد کو مشورہ دیا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہر گز اپنی جان کو خطرہ میں نہ ڈالو۔ سر سیّد نے کہا کہ میں تو ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور

قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں بس اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہوں۔ مجھ کو گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے سرسیّد کے اس عزم پر الطاف حسین حالی (1966، ص89) رقمطراز ہیں:

''رائے شنکر داس نے جب سرسیّد کی آمادگی اس درجہ دیکھی اور سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ سرسیّد نے اوّل سو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور اس کے بعد پھر کچھ کم پانچ سو جلدیں اس کتاب کی ولایت بھیج دیں اور ایک جلد اپنے پاس رکھ لی۔''

سرسیّد نے اس کتاب میں ہندوستانی عوام اور خاص کر مسلمانوں کو جن پر حکومت کا سارا عتاب تھا اور انگریزوں کو مسلمانوں سے جو بدگمانی تھی اُس کو دُور کیا ہے اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات، جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے اور گورنمنٹ مسلمانوں پر لگاتی تھی نہایت دلیری کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اُن کی تردید کی بلکہ تمام الزامات ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت پر لگائے۔ مولانا الطاف حسین حالی (1966، ص64) مزید قمطراز ہیں:

''اِس کتاب کے سرکاری طور پر کئی ترجمے ہوئے۔ انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اور اس پر متعدد بار بحثیں بھی ہوئیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا۔''

اس کتاب کا اگر ہم وسیع النظری سے جائزہ لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب دراصل آزادیِ وطن کی راہ میں پہلا سنگِ میل ہے جس کو سرسیّد نے نصب کیا تھا۔ سرسیّد جنگِ آزادی میں کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کے صلے میں جب انگریز اُن کو انعام و اکرام سے نوازتے ہیں

تو وہ قبول نہیں کرتے اور پھر جنگِ آزادی کے اثرات ابھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ اسبابِ بغاوت لکھ کر انگریزوں کے مزاج کو برہم کر دیتے ہیں۔ سر سیّد احمد خان کے کردار کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ڈاکٹر فوق کریمی (1990، ص96) کرتے ہیں:

''سر سیّد انگریزوں کے حامی ضرور تھے لیکن نہ اُن کی ذہنیت کو غلامانہ کہا جا سکتا ہے اور نہ اُن کے کردار میں ضمیر فروشی کی چھاپ دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ آگرہ دربار کا اس لئے بائیکاٹ کرتے ہیں کہ اُن سے ہندوستانیوں کی ذلت دیکھی نہیں گئی۔ اپنے صوبے کے گورنر سے اس بات پر ناراض ہوئے کہ اُس نے اپنی کتاب 'لائف آف محمدؐ' میں آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس پر حملے کئے اور اس کا جواب انگلستان میں خطباتِ احمدیہ لکھ کر دیتے ہیں۔''

ایک اور جگہ سر سیّد انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی پر اُن کو بے باکانہ مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور کسی پیرائے میں انگریزوں کے ادارے سے پردہ اُٹھاتے ہیں لجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شمولیت کی بنا پر حکومت پر تنقید کرتے ہوئے سر سیّد احمد خان (1859، ص99) اظہار خیال کرتے ہیں:

''لجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین وضوابط کی جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہوسکی اور اغراض رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کے درجات سے تھا ملحوظ نہیں رہیں۔ اور وہ بعض باتیں جو درحقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت ہندوستانیوں کے صادر

ہوئیں قطعِ نظر اس کے وہ فی نفسہٖ اچھی تھیں یا بُری زیادہ تر اُن
کے خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔''

جو حضرات سر سیّد پر یہ اعتراض کرتے رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو انگریزوں کا غلام بنانا چاہتے تھے اور انگریزی حکومت کو خوش کرنے کی غرض سے حکام کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی کرتے تھے حقائق سے وہ اعتراضات قطعاً غلط ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ سر سیّد نے سیاست، تعلیم اور معاشرت کے مختلف معاملات اور نظریات میں بڑے بڑے انگریز حکام سے اختلاف کیا اس سچائی کی دلیل عشرت رحمانی (سن ندارد، ص 106) پیش کرتے ہیں:

''سچائی اور حق کے معاملے میں وہ ہمیشہ انگریزوں سے ڈٹ
کر مقابلہ کرتے رہے۔ خصوصاً دین کے مسئلہ میں کبھی کسی
انگریز سے دب کر نہیں رہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت
انگریزی حکومت کے عہد میں مذہبی مسائل پر اُن کے مضامین
اور کتابیں اور خصوصیت سے گورنر ولیم میور کی کتاب ''لائف
آف محمدؐ'' کا جواب لاجواب ہے۔''

سر سیّد احمد خان کی علمی خدمات قرطاس ابیض پر پھیلی ہوئی ہیں۔ مسلم رہنماؤں میں سے عظیم رہنما قائداعظم محمد علی جناح نے علی گڑھ تحریک کو ہدیہ تبریک پیش کیا۔ قائداعظم کے ارشادات عشرت رحمانی (سن ندارد، ص 109) پیش کرتے ہیں۔

''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تاریخِ پاکستان کا دیباچہ ہیں۔ اس
کے طلباء ہماری آزادی کی تحریک کے لشکر کا ہراول دستہ ہیں۔
علی گڑھ ایک چھوٹا پاکستان ہے اور پاکستان ایک بڑا علی گڑھ
ہوگا۔''

سر آغا خان نے صحیح معنوں میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا ذکر کرتے ہوئے جن الفاظ میں علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ رہنماؤں کی شاندار سیاسی جدوجہد اور رہنمائی کا اعتراف کیا۔ ان کے جذبات کو عشرت رحمانی (سن ندارد، ص 108) نے پیش کیا ہے:

''علی گڑھ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ ہوتا۔''

بابائے ملت سر سیّد احمد خان کی جدید تعلیم کی کوشش کے متعلق آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو (1962، ص 461) نے لکھا ہے:

''سر سیّد نے اپنی پوری قوت جدید تعلیم کی طرف مرکوز کر دی اور اپنی قوم کو ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی قوم کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک دشوار کام تھا اور مسلمانوں کی ہچکچاہٹ دُور کرنا مشکل تھا۔''

سر سیّد اِس تہذیبی، علمی اور فکری سرمایہ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے جو مشرق کے لئے ایک متاعِ عزیز کا حکم رکھتا تھا۔ آثار الصنادید کی تصنیف اور آئین اکبری کی تصحیح و ترتیب اِس کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ مغربی مفکرین و مستشرقین نے قرآن پاک، سیرت مقدس اور مسلمانوں کے افکار و عقائد پر اعتراضات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ سر سیّد احمد نے جوابات دیئے۔ جن کے بارے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی (سن ندارد، ص 15) لکھتے ہیں:

''سر سیّد احمد خان نے علمی اور سائنسی انداز میں لگائے گئے الزامات کا جواب دیا۔ اُن کی اس علمی کاوش نے مناظرہ کاری کو غیر علمی انداز سے بچالیا اور خود مذہب کو نئے دَور کی علمی ' سائنسی حیثیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جو اس دَور میں باوصف استطاعت اچھے اچھوں کے بس کی بات نہ تھی۔''

زمانہ اور زندگی کے کسی اہم دوراہے پر جو افراد یا جماعتیں کوئی تاریخی فیصلہ کرتیں اور دُوررس قدم اُٹھاتی ہیں ان سے اختلاف بھی کیا جاتا ہے۔ یہ اختلاف سنجیدہ فکر فرمائی کا نتیجہ بھی ہوتا ہے اور اس میں عصری رویئے اور معاصرانہ چشمکیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ خود فیصلہ کرنے والے اپنے فکر و عمل میں بعض ناگزیر کمزوریوں اور وقتی تضادات کے شکار ہوں، یہ بھی ممکن ہے۔ سرسیّد کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کے بعض فیصلوں سے ان کے مخالفین کے علاوہ ان کے مخلصین نے بھی اختلاف کیا۔ اُن کے خیالات، سیاسی نظریات ان کی زندگی میں اور اس کے بعد موضوع بحث و گفتگو بنتے رہے۔ ایک طبقہ جوان کے خیالات اور خاص طور پر انگریز دوستی کو ناپسند کرتا تھا وہ اِن کی زندگی میں بھی سخت تنقید کرتا تھا بلکہ اُن کو کافر، نیچری اور مُلحد لکھنے سے بھی گریز و پرہیز نہ کرتا تھا۔ ان کے سیاسی نقطۂ نظر کو آزادی پسند حلقوں نے نہ صرف اس وقت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا نہ اس کے بعد پورے تاریخی پس منظر اور عصری تناظر میں اس کا جائزہ لینے کو تیار ہوا۔ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر فوق کریمی (1990، ص 17) لکھتے ہیں:

> ''یہ بھی عجب ستم ظریفی ہے کہ اب جب کہ ہندوستان آزاد ہے پھر بھی سیّد احمد خان کو ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے بلکہ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سیّد احمد خان کے سیاسی افکار سے ناواقفیت کی بنا پر اس محبِّ قوم اور قوم پرستار وطن کی کوششوں کو انصاف کی نظر سے نہیں دیکھتے۔''

علی گڑھ کی حمایت اور مخالفت کرنے والوں میں ہر نقطۂ نظر کے لوگ ملتے ہیں جن کی ہوش مندی، خلوص اور حقیقت پسندی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ علی گڑھ تحریک کے مندرجہ ذیل پہلو ہمیشہ معرض بحث رہے ہیں، مذہب، اُردو ہندو مسلم تعلقات، انگریز اور انگریزی حکومت، انگریزی

زبان، مغرب کا اثر اور تقاضے، بالفاظ دیگر قدیم اور جدید کے ناگہانی تصادم، سیاسی اور مذہبی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات نے ہندو قومیت اور مسلم قومیت کو جنم دیا۔ سر سیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری (2000، ص270) لکھتے ہیں:

''یہ ہے وہ پس منظر جس میں سر سیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک پروان چڑھی اور جس میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے مدِ مقابل مسلمانوں کو ایک جداگانہ پلیٹ فارم پر جمع ہونے اور اپنے سیاسی و تہذیبی حقوق کی مدافعت کرنے کی ترغیب دی۔''

ہندوستان میں ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ (سر سیّد) تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی۔ باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمان کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی کو بغیر تلوار کے زور سے حاصل نہیں ہوا۔ سر سیّد احمد خان کی شخصیت کی ہمہ گیری اور جامع الصفت ہونے کے بارے میں ڈاکٹر نظر کامرانی (1998، ص127) لکھتے ہیں:

''سر سیّد ایک شخصیت ہی نہیں ایک ادارہ، ایک تحریک تھے۔''

علامہ اقبال جس طرح سر سیّد تحریک سے واقف اور اس کے مقاصد جلیلہ سے فیض یاب ہوئے، اس کا تذکرہ خود علامہ اقبال نے اعترافات کے بعد کیا۔ جس کو ڈاکٹر معین الدین عقیل (75-1974، ص10) بیان کرتے ہیں:

''اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی (سر سیّد) روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردِ عمل کیا۔''

آج سے نصف صدی قبل سر سیّد احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لئے جو راہ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کا

اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال علی گڑھ تحریک کے بارے میں جوالفاظ کہتے ہیں وہ ڈاکٹرمعین الدین عقیل (75-1974، ص 4) بیان کرتے ہیں:

''یہ گویا ہماری نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی۔''

یہ خیال کہ علی گڑھ کے طلبہ بالعموم خوش حال گھرانوں کے ہوتے اور اسکی وضع ولباس اخلاق، آداب، کھیل اور ورزش کے دلدادہ تھے جس سے انگریز حاکموں کا تقرب یا ان کی خوشنودی حاصل ہو محلِ نظر ہے دولت مند گھرانوں کے لڑکے ضرور پڑھنے آتے تھے۔ وضع اور لباس کے بارے میں پروفیسر خورشید احمد صدیقی (2000، ص 48) لکھتے ہیں:

''وضع اور لباس یعنی ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ، پتلون نما سفید پاجامہ، موزہ انگریزی، جوتا بطور ''یونیفارم'' کالج نے مقرر کیا تھا۔ اس میں انگریزوں کو خوش کرنے کی کون سی چیز ہے کالج سے باہر یا طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے بعض طلباء انگریزی لباس اس طرح اور اس حد تک استعمال کرتے تھے جس طرح کوئی دوسرا۔''

علی گڑھ نے بیسویں صدی اور خصوصیت سے پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک نیا تاریخی کردار بھی ادا کیا جو انگریز اور ان کے اقتدار پر آخری ضرب لگانے کا ذریعہ بنا۔ اس تاریخی کارنامے کا اظہار پروفیسر خورشید احمد (1977، ص 56) اس طرح کرتے ہیں:

''علی گڑھ کا سب سے دلچسپ اور تاریخی پہلو یہ ہے کہ آخری دَور میں مسلم قومیّت اور دو قومی نظریہ تحریک کا گہوارہ علی گڑھ بنا۔ اس طرح جو ادارہ انگریزوں سے قرب و مفاہمت کے جذبے سے قائم ہوا تھا وہی انگریزی اقتدار پر آخری ضرب لگانے کا ذریعہ بنا۔''

سرسیّدتحریک، بظاہر مفاہمت کی تحریک محسوس ہوتی ہے لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایک حقیقی مئورخ کی حیثیت سے اس تحریک کا سب سے اہم پہلو مزاحمتی نوعیت کا ہے درخت اپنے ثمر سے پہچانا جاتا ہے واقعات کی کامیابی اور ناکامی نتائج سے وابستہ ہوتی ہے بالکل اسی طرح مزاحمت کا اندازہ اس کے ثمرات سے کیا جانا چاہیئے۔اس پہلو سے سرسیّدتحریک اگرچہ براہِ راست مزاحمت میں نہیں آتی تاہم مزاحمت سے جوثمرات حاصل کرنے کی کوشش ہوئی، سرسیّد نے ''مخفی'' مزاحمت سے حاصل کی۔علی گڑھ تحریک اُن معنی میں مزاحمتی تحریک نہیں ہے جن میں دیوبند، ندوہ وغیرہ ہیں۔جنہوں نے مطلقاً دینی بنیادوں پر تحریک چلائی اور ان کی مزاحمت کا مقصد صرف اورصرف دین کے عقائد کو بچانا تھا۔اِن دینی تحریکوں نے مزاحمت سے کچھ نتائج ضرور حاصل کئے یعنی اسلامی شعائر اور ایک حد تک فرنگی اثرات سے محفوظ کرلیا۔اس طرح مسلمانوں کو دینی محاذ پر کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔سرسیّد احمد خان نے انہی نتائج کو حاصل کرنے کے لئے دین کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت کو بہتر بنانے کی سعی کی۔اس میں مزاحمت کا شدید اور جارحانہ انداز نہیں تھا۔موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے مخالفانہ اور معاندانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ انگریز اور انگریزی حکمت عملی کا بظاہر ساتھ دیا تاکہ پہلے مسلمان اُن کے شر اور عداوت سے محفوظ ہوجائیں پھر اپنی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لئے راستہ بنائیں اور اس کے بعد وہ دینی عقائد اور اسلامی روح کو فرنگی یلغار سے بچائیں یہ مزاحمت کا انداز موافقت میں چھپا ہوا تھا کیونکہ اس میں بھی براہِ راست مزاحمت نہ کرتے ہوئے وہی ثمرات بلکہ اس سے بہتر ثمرات حاصل کئے جو مزاحمتی اداروں سے منسلک کئے جاتے ہیں۔یوں مزاحمت کے نتائج کے حصول کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سرسیّدتحریک کو بھی مزاحمتی تحریک میں شامل کرسکتے ہیں۔

دینی تعلیمی اداروں کا کردار

برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی وفوجی برتری سے لے کر 1857ء تک علماء کی ایک جماعت دربار سے وابستہ رہی، جس نے نہ صرف قضاء اور افتاء میں اپنے فرائض انجام دیئے بلکہ تخت وتاج کی شکست وریخت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علماء ہی کی ایک دوسری جماعت ایسی بھی تھی، جو سرکاری جاہ وجلال سے الگ رہ کر درس وتدریس اور وعظ وارشاد میں برابر مشغول رہی۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کی قانونی اور مذہبی زندگی کی تاریخ دراصل علماء کی علمی سرگرمیوں کی ایک ایسی مستند روداد ہے جس میں مسلم جماعت کے فکری، مذہبی اور اجتماعی خدّ وخال کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر چند آج تعلیم کا ایک شعبہ علماء کی قلمرو سے باہر نکل گیا ہے، لیکن برصغیر کی مُسلم تاریخ میں درس وتدریس کی رونق انہی سے قائم رہی اور اسلامی قانون کی تعبیر وتشریح کا فریضہ بھی انہی نے سرانجام دیا۔ مسلم سوسائٹی میں علمائے حق اور اصحابِ معرفت کی ایک جماعت برابر موجود رہی جو صدیوں تک داد ورسن کو آزمائش میں ڈالتی رہی اور ہر ظالم حکمران کے خلاف آواز اٹھاتی رہی۔ مذہبی علوم کی نشر واشاعت میں ہندوستانی علماء کی خدمات کو عرب دنیا نے بھی سراہا۔ مثلاً علامہ رشید رضا نے کہا تھا کہ اگر اس زمانے میں علماء ہند نے علم حدیث کی طرف دھیان نہ دیا ہوتا، تو آج یہ علم مشرق سے ناپید ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ اہل علم سے یہ توقع بے جا نہ تھی کہ وہ برطانوی ہندوستان میں علماء کی مذہبی، علمی اور سیاسی خدمات اور اجتماعی زندگی پر ان کے گہرے اثرات پر سنجیدگی سے قلم اٹھائیں گے۔ علماء کی نگرانی میں کام کرنے والے بعض اسلامی اداروں کو موضوع سخن بنایا ہے۔ دارالعلوم دیوبند اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ جس نے تعلیم، مذہب اور تہذیب کے حوالے سے ہندوستان کی خدمت کی ہے وہ انگریزی نظامِ تعلیم کے مقابلے میں مزاحمت کا درجہ رکھتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند

دیوبند کا مدرسہ 30 مئی 1867ء کو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھوں قائم ہوا۔ 9 سال مدرسہ بالکل ابتدائی حالت میں رہا۔ 1876ء میں نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم اور علمی مرکز میں تبدیل ہوگیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس کے پہلے طالب علم تھے۔ دارالعلوم دیوبند انہی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس مدرسہ کے بارے میں پروفیسر خورشید احمد (1977، ص 81) بحوالہ محمود الحسن رقمطراز ہیں:

> ''جہاں تک میں جانتا ہوں 1857ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ 1857ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کا قیام وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اور اس کے فضلاء نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ ملک کے ایسے حالات میں جب تعلیم خصوصاً تعلیم دین کا تصوّر نہ تھا۔ انگریزوں کے قائم کردہ اسکول تھے، جو یا تو اپنے طلبہ کو عیسائی بنا کر چھوڑتے یا کم از کم مذہب سے بیزار کر دیتے، دیوبند نے ملک کی صحیح دینی رہبری کی اور پورے ملک میں دینی فضا پیدا کر دی۔ اس سلسلے میں دیوبند کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ سیّد محمد محبوب رضوی (1954، ص 185) لکھتے ہیں:

> ''دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب وتمدّن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے۔

ہندوستان کے طویل وعریض برِّ اعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر میں نظروں کو خیرہ کر دیا تھا۔''

''اس حقیقت سے انکار کرنا دنیا کی سب سے بڑی سچائی سے انکار ہوگا کہ ہندوستان کے اسلامی اور دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم نے اسلام اور مسلمانوں کی جو جلیل الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی نظیر دنیا کے کسی نظامِ تعلیم میں نہیں مل سکتی یہ مولانا محمد قاسم کی ایک یادگار ہے جس کے متعلق غلام رسول مہر (1970، ص250) لکھتے ہیں:

''ایک یادگار ـــ دارالعلوم دیو بند ـــ ایسی ہے جو قریباً ایک صدی سے پاک وہند کی وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام وبقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدّس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین وسیاست دونوں دائروں میں قابل فخر ہیں۔''

اس حقیقت سے تو سب ہی واقف ہیں کہ دارالعلوم دیو بند نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ایشیا کا سب سے بڑا دینی مرکز ہے۔ جس میں دنیا بھر کے طلباء تعلیم پاتے ہیں اور جس کے فیضانِ علمی کی چادریں تمام ایشیا پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پروفیسر سعید اختر (1991، ص105) لکھتے ہیں:

''دیو بند برصغیر پاک وہند میں نہ صرف دینی علوم کی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور اسلامی تہذیب اور دینی وروحانی تربیت کا سب سے بڑا گہوارہ ہے بلکہ اس سے فیض پا کر ہزاروں علماء وفضلاء پاک وہند کے قریہ قریہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں

تک کہ بیرون ہند بھی تبلیغ واشاعتِ اسلام کی گراں قدر
خدمات انجام دے رہے ہیں۔''

دارالعلوم دیوبند کی علمی اور دینی خدمات اتنی واضح ہیں کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں محسوس ہو جاتی ہیں۔اس حوالے سے سیّد محمد محبوب رضوی (1954،ص 27) لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے اور
پڑھاتے رہے ہیں، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، مگر کم،
جنہوں نے علم کو محض علم کے لئے سیکھا اور سکھایا، ان لوگوں کی
عزت بادشاہوں سے زیادہ ہوتی تھی، آج دارالعلوم کے
بزرگ اس طرز پر چل رہے ہیں۔''

دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان میں اسلامی اور مذہبی زندگی کے قیام اور استحکام کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کا سبھی نے اعتراف کیا ہے۔اس خدمت کے حوالے سے سیّد محمد الحسنی (1964،ص 73) لکھتے ہیں:

''اس حقیقت سے کوئی ہوش منداور منصف مزاج انسان انکار
نہیں کرسکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشے
گوشے میں پھیل کر دینِ خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے
اوراس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے
ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقاء واستحکام میں
بیش قیمت مدد ملی ہے۔اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم،
اہلِ دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے

اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔"

دارالعلوم دیوبند نے اُمت کی معاشرتی اور سماجی زندگی میں تعمیر و اصلاح کے تقریباً ہر گوشے کو اپنی خدمات سے منوّر کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ اس حوالے سے مولانا محمد قاسم نانوتوی (سن ندارد، ص 10) لکھتے ہیں:

> "دینی علوم اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی جو امانت اپنے بزرگوں سے اس ادارے نے پائی ہے وہ اس نے پوری دیانت داری کے ساتھ اُمت کو منتقل کر دی ہے۔ یہ ادارہ اسلامی علوم، تہذیب اور ثقافت کا سب سے بڑا امین ثابت ہوا ہے۔"

مغربی تہذیب و تعلیم کی اس یلغار کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک دوسری یلغار کا بھی مقابلہ کرنا پڑا، یہ عیسائی مشنریوں کی یلغار تھی۔ اسکے علاوہ تشکیک کی ایک طاقت ور تحریک بھی جاری تھی۔ جس کا مقصد اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو مسلمان نوجوان کی نظر میں مشتبہ مشکوک بنا دینا تھا۔ خواہ اس کا تعلق شریعت و قانون سے ہو یا تہذیب و تمدّن اور ثقافت و تاریخ سے۔ دارالعلوم دیوبند کے علماء کی مدافعت کے بارے میں سیّد محمد محبوب رضوی (1954، ص 504) رقمطراز ہیں:

> "دارالعلوم دیوبند کے علماء نے ان دونوں تحریکوں اور طاقتوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا، انہوں نے معذرت و دفاع کی پالیسی کو ترک کر کے بھرپور علمی تنقید کا راستہ اختیار کیا، اس کے نتیجے میں تبلیغ عیسائیت اور تشکیک کی پوری مہم پسپائی اختیار

> کرنے پر مجبور ہوگئی اور مسلمانوں کے اندر اسلام پر نیا اعتماد، اپنی تہذیب وثقافت پر فخر کا احترام پیدا ہوا۔''

دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر دوسرے تعلیمی اداروں نے قرآن وحدیث، فقہ اور علمِ دین کی نشر واشاعت کا مقدس فریضہ نہایت دیانت داری اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ان اداروں نے جس قدر سستی تعلیم دی۔ اس کے اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو اس کی نظیر پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ اس تحریک کا تنقیدی جائزہ پروفیسر عبدالسلام چوہدری (1996ء ص 81) نے پیش کیا ہے۔

> ''اس تحریک کے ذریعے اسلامی علوم کا تحفظ کیا گیا لیکن عصری تقاضے پر توجہ نہ دی گئی۔ اسلامی مدارس کی تعلیمی روایات اور خصوصیات کو دیوبند کے نصاب میں سمونے کی کوشش کی گئی جس سے نصاب بوجھل ہو گیا۔ انگریزی نظامِ تعلیم کے عملی نفاذ کے ساتھ ہی فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم ہوگئی لیکن دیوبند نے اسے بلند مقام دیا۔ فلسفہ، منطق اور علم الکلام پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی گئی۔ جس نے بعد میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔ جدید علوم کی تعلیم کو بالکل نظرانداز کر دیا اگر دارالعلوم دیوبند جدید علوم کو اپنے نصاب میں شامل کر لیتا تو اسلام اور جدید سائنس کا تضاد نہ ہوتا۔ دیوبند نے دینی تعلیم اور جدید تعلیم میں ایک خلیج حائل کر دی۔''

ہم دیوبند کی عظمت وخدمات کے دل سے معترف ہیں۔ لیکن دیوبند نے جو نصابِ تعلیم رائج کیا اس کا بڑا نقص بھاری بھرکم ہونا ہے۔ اس کی وجہ سے درسِ نظامی کا توازن مفقود ہو گیا اور

متوازن فکر وذہن کے لوگ پیدا ہونے ختم ہوگئے۔ بھاری پن کا احساس بعض اکابر دیو بند کو بھی ہے۔سیّد مولانا مناظر احسن گیلانی (سن ندارد، ص 291) لکھتے ہیں:

''دار العلوم دیو بند کا تعلیمی نصاب کافی بوجھل طویل وعریض ہوتا چلا گیا۔ اس نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صَرف ہو جاتا ہے۔''

دینی علوم،تفسیر،حدیث اور فقہ کو بھی اس نصاب میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جس کے وہ مستحق ہیں اس وجہ سے طلباء کے ذہن پر چند ابواب کا تو غیر معمولی غلبہ رہتا ہے لیکن اسلامی تصورات کی جامعیت کا احساس نہیں ہوتا۔ نصاب کی اس کمزوری کے حوالے سے مولانا قاری محمد طیب (سن ندارد، ص 175) رقمطراز ہیں:

''تفسیر میں سورۃ بقرہ، بلکہ پہلے پارہ کے ربُع اوّل پر زور دیا جاتا ہے۔ بقیہ کا مطالعہ سرسری طور پر ہوتا ہے، حدیث پڑھاتے وقت صرف اثبات حنفیت پر زور ہوتا ہے۔ فقہ میں طہارت اور عبادت کے ابواب پر زور ہوتا ہے۔ معاملات اور دوسرے ابواب کا مطالعہ سرسری ہوتا ہے۔''

اب مدرسہ کے منتظمین اعلیٰ کو بھی اس نقص کا احساس ہوگیا ہے۔ نصاب کے ہلکا ہونے کے متعلق مولانا محمد طیب (سن ندارد، ص 267) لکھتے ہیں:

''تقسیم ہند کے بعد نصابِ تعلیم میں جو اصلاح ہوئی ہے، اس کے بعد وہ پہلے کے مقابلے میں ہلکا ہو گیا ہے۔ اس میں فلسفہ کی غیر ضروری کتب کو خارج کر دیا گیا ہے۔''

دیوبند کی تعلیمی، مذہبی اور تہذیبی مزاحمت نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا اور اسلامی علوم اور روایات کو طوفان کے تھپیڑوں میں روشن رکھا۔ دیوبند کے نظام نے اپنی حد تک اُمّت کے مزاج کو بگڑ جانے سے بچایا ہے اور انگریز حکمرانوں اور بیرونی تہذیب کے مقابلے میں مفاہمت، مصالحت کی بجائے مقاومت اور ٹکراؤ کا علم بلند کیا ہے۔ دیوبند کا یہ کارنامہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بناء پر وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ شیخ محمد اکرام (1975، ص208) اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''دیوبند کا قیام جنگ آزادی کے بیس سال بعد ہوا، لیکن جلد ہی اس نے قوم کے تعلیمی نظام میں معزز جگہ حاصل کر لی اور آج قدیم طرز کی اسلامی درسگاہوں میں سب سے اہم گِنا جاتا ہے۔ اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج اچھا تھا اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا۔''

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی وہ دیوبند کی انقلابی و سیاسی تحریکات کی مرہونِ منّت تھی اور جو انقلابی اور حرّیت پسند اُٹھے وہ دیوبند کے سرچشمۂ فکر کا فیضان تھا۔ مولانا محمد طیب (1969، ص35) اس بارے میں رقمطراز ہیں:

''دیوبند کے اکابر نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بیش از بیش حصہ لیا۔ اس راستے کی تمام صعوبتوں کو برداشت کیا اور ہر آزمائش میں پورے اُترے۔ دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور و غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار و مرتبہ حاصل کر لیا ہے، وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور انہیں اس پر فخر کا جائز حق ہے۔''

دارالعلوم دیو بند انقلاب کا مرکز اور سیاسی تربیت گاہ تھی۔ اس نے اسلام کے جاں نثاروں اور ملت کے غم گساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی۔ جس کے متعلق مولانا سیّد محمد میاں (1947، ص60) لکھتے ہیں:

> ''اس جماعت نے مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑا، برٹش استعمار کے سحر کو توڑا، وقت کی استبدادی قوتوں سے پنجہ آزمائی کی، اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار کی بحالی کے لئے خود بھی تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا اور آبرومندانہ زندگی کے حصول کے لئے خود بھی اپنی جانیں قربان کیں اور دوسروں کو بھی ایثار کا سبق دیا۔''

دارالعلوم دیو بند ایک مدرسہ کی حیثیت سے اُبھرا اور بہت جلد ایک تعلیمی سمندر کی حیثیت سے پھیلا۔ اس نے ملک کی علمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی میں بڑا فعال کردار ادا کیا ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ قوموں کی تاریخ کو بنانے والے اداروں کا انحصار بلند و بالا عمارت اور ساز و سامان کی فراوانی پر نہیں، اخلاق، سعی پیہم، توکل علی اللہ اور اعانت مسلمین پر ہے لیکن اپنی ان کمزوریوں کے باوجود دیو بند کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ اور آج بھی انہی مدارس کی شکل میں یہ عظیم خدمت جاری ہے۔ دیو بند کے نظام نے اپنی حد تک اُمت کے مزاج کو بگڑ جانے سے بچایا ہے جو منفی مزاحمت کی صورت میں نظر آتا ہے حالانکہ دیو بند کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔ دیو بند کا یہ کارنامہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بنا پر وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ

انگریزوں کے نظامِ تعلیم کی مزاحمت میں یہ تیسرا رجحان علی گڑھ اور دیوبند دونوں سے عدم اطمینان کی پیداوار ہے۔ بعض علماء نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ جدید وقدیم میں افراط وتفریط سے مسلم قوم کے علمی و تعلیمی، معاشی ومعاشرتی مسائل حل نہیں ہوسکتے یہ بات ضروری ہے کہ ایسی درس گاہ قائم کی جائے جو کہ جدید وقدیم دونوں کا سنگم ہو۔ جہاں سے فارغ التحصیل علماء وقت کے اہم تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ اس لئے ندوہ نے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان راستہ بنایا۔ اس نے علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو صحیح انداز میں پیش کیا۔ قرآن پاک، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، شریعت اور تصوف کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت انگریزی اور ہندی کو بھی شامل نصاب کیا۔

ندوہ مولانا شبلی نعمانی کی کوششوں سے قائم ہوا وہ سمجھتے تھے کہ ہندی مسلمانوں کا علاج ایسا معجون مرکب ہے جس کا ایک جزو مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔ اس لئے نئے تقاضوں کے پیشِ نظر نصاب میں جُرأت اور حوصلے سے ترمیم وتبدیلی کی۔ جب ترمیم شدہ نصاب کو علماء کے گروہ نے تسلیم کرلیا تو قدیم نصاب کی اصلاح کے لئے راستے کھل گئے۔ اسکے نتیجے کو حکیم محمد سعید (1984، ص104) بحوالہ عبدالکریم عابد یوں پیش کرتے ہیں:

> ''ندوۃ العلماء'' نے نئے زمانے کی ضرورت کے مطابق ایسے
> نئے علماء پیدا کئے جو قدامت کے جوہر کو اپنے میں جذب کئے
> ہوئے تھے اور نئے زمانے کے تقاضوں سے بھی باخبر تھے۔''

یہ وہ دَور تھا کہ مسلمانوں کے مختلف گروہوں حنفی، شافعی، اہلحدیث میں مناظرہ کا بازار گرم تھا۔ جس کے نتیجے میں فسادات، مقدمہ بازی، ہواخیزی ہورہی تھی۔ اصلاحِ نصاب اور رفع نزاع باہمی کے لئے مولانا شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحبِ تفسیر حقانی نے اس کے قواعد وضوابط

مرتب کئے۔ اکابرین قوم سرسیّد احمد خان، نواب محسن الملک، نواب وقارلملک نے بھی اس کو پسند کیا اور تحریر وتقریر کے ذریعے اس کا خیر مقدم کیا۔مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (1961، ص139) رقمطراز ہیں:

''رفتہ رفتہ ہندوستان کے اکثر اصلاح پسند اور دردمند علماء عمائد جدید سربرآوردہ تعلیم یافتہ حضرات اور ملت کے مختلف مکاتب خیال کے مؤثر نمائندوں نے اس کی دعوت کو قبول کیا اور اس کی مجلس انتظامی میں بحیثیت رکن یا اس کے دائرہ عمل میں بحیثیت کارکن شریک ہوئے۔''

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ارباب نے جہاں نصابی لحاظ سے قدیم وجدید کا ایک بہترین امتزاج پیدا کیا۔ وہاں ایک علمی وبلند پایہ رسالہ ''الندوہ'' کے اجراء کا بھی فیصلہ کیا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی (1943، ص441) رقمطراز ہیں:

''اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علومِ اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے۔ زبان وبیان کے نئے پیرائے معلوم ہوئے۔''

''الندوہ'' رسالے کا اثر خود ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کے طلبہ پر بھی پڑا اور ذہین طلباء نے اس پرچے میں نہایت بلند پایہ علمی مضامین لکھے اور طلباء میں ادیبانہ صلاحتیں اُجاگر ہوئیں اور عربی زبان و ادب کے بہترین علماء پیدا ہوئے۔ جن کے متعلق راجہ طارق محمود (1985، ص355) لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے۔ مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت، ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی پیدا نہیں کرسکی۔''

ندوہ کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے اور یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تحریک اسلامی کو مردانِ کار ملے ان میں دیوبند کے مقابلے میں ندوہ کے تیار کردہ افراد زیادہ ہیں۔ ندوہ نے جو علماء پیدا کئے وہ تعلیم، مذہب اور تہذیب کے حوالے سے دنیائے اسلام کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ دارالعلوم ندوۃُ العلماء سے متعلق مشہور سکالر مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (1961،ص141) لکھتے ہیں:

''دارالعلوم ندوۃُ العلماء نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اسلام کے ایسے داعی وشارح تیار کئے جائیں جو دین حنیف کو جدید دنیا کے سامنے مؤثر انداز اور جدید اسلوب میں پیش کرسکیں۔ ندوہ کو بحمداللہ اپنے مقاصد میں قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے علماء تیار ہوئے جو جدید دنیائے اسلام کے لئے قابلِ تقلید ہیں۔ ان فضلاء نے اسلامی ادب، علم کلام، تاریخ سیرت نبوی کے موضوع پر نہایت قیمتی لٹریچر فراہم کردیا۔''

ندوہ قدیم اور جدید کے امتزاج کی کوشش تو ضرور ہے، لیکن اس کی بہترین اور مناسب کوشش نہیں ۔ کیونکہ جس نوعیت کی تخلیقی اور انقلابی جدو جہد کی ضرورت تھی وہ ندوہ نہ کر سکا۔ ندوہ کی پوری تاریخ میں ایک ٹھہراؤ اور انقلابیت کی بجائے ایک سکونی کیفیت ہے۔ تنقیدی نقطہءِ نظر سے پروفیسر خورشید احمد (1977، ص90) لکھتے ہیں:

''ندوہ نے جدید تعلیم کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن اس کا حصہ اتنا کم تھا کہ ندوہ کے طلبہ کی رسائی مغربی علوم کے اصل ماخذ تک نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو مغرب سے استفادہ کر سکے اور نہ مغرب کے حقیقی چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔''

علی گڑھ اور دیو بند کی جو مقبولیت اپنے اپنے حلقوں میں ہوئی وہ ندوہ علماء کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس بارے میں پروفیسر سیّد محمد سلیم (1980، ص294) رقمطراز ہیں:

''دینی نصاب، تقویٰ اور پرہیز گاری میں بھی ندویوں کا کوئی امتیازی رنگ نہیں ہے۔ اسلامی فکر کو نکھارنے، اصلاحی یا فکری انگیخت میں بھی کوئی ممتاز کارنامہ نہیں ہے چند منفرد ہستیاں البتہ ایسی ضرور پیدا کیں جن کی اسلامی خدمات قابلِ تعریف ہیں۔''

ندوہ کے فارغ طلبہ نے عربی تحریر وتقریر کا لوہا ہندوستان سے باہر عرب ممالک سے بھی منوالیا۔ ندوہ اس وصف میں ممتاز ہے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں انہوں نے اُردو زبان میں گراں قدر اضافے کئے ہیں بلکہ درحقیقت دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ندوہ ہی کا تتمہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ صحافت اور اِسلامی تاریخ کے میدان میں اہلِ ندوہ نے رہنمائی کے فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ الغرض ندوۃ العلماء لکھنو تعلیمی، مذہبی اور تہذیبی تحفظ کے لئے ایک سنگلاخ زمین

پر، ایک نئی کوشش کے مترادف ہے۔قدیم وجدید کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ندوہ نے روشنی کی ایک نئی سی شمع روشن کی جو اِن مہیب تاریکیوں کا سینہ تو نہ چیر سکی لیکن اسی نے اِن کے خلاف احتجاج کوضرور وجود بخشا۔

مدرسۃ الاصلاح۔سرائے میر

مدرسۃ الاصلاح نے قدیم وجدید علوم کی ترکیب صحیح توازن کے ساتھ پیش کر کے مسلمانوں کی تعلیمی، علمی، عملی اصلاح، علم وعقیدہ کی تمام گمراہیوں سے پاک کرنے اور صحیح شاہراہ پر کھڑا کرنے کے لئے صلاح وفلاح کا مدار مذہبی تعلیم پر رکھا۔ مذہبی تعلیم نے ہی عربوں کو شتر بانی کے درجہ سے اُٹھا کر عالم کی گلہ بانی کے منصبِ عظیم اور خلافتِ الٰہی کے شرف سے سرفراز کیا تھا۔مدرسہ کے مزاحمتی انداز کی وضاحت مولانا محمد شفیع خان (1933، ص4) لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کے متعلق اصل راہ عمل یہ ہے کہ قرآن کو اس کی اصلی جگہ دی جائے۔اس کی اصلی جگہ یہ ہے کہ وہ ہمارے تمام علم وعمل کا سرچشمہ ہو۔ہم وہ جانیں جس کی وہ ہمیں تعلیم دیتا ہے اور وہ کریں جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔''

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے امتیازات میں سے ایک امتیاز قرآن حکیم کی محققانہ تعلیم ہے۔اس لحاظ سے ہندوپاک میں بالکل منفرد اور مثالی درس گاہ ہے۔جس نے تعلیمات میں اساس اور اصل محور قرآن حکیم کو بنایا۔اس نے تعلیم وتعلّم ، درس وتدریس اور مطالعہ وتحقیق کی ایک نئی طرح ڈالی۔اس لئے اس کے نتائج بڑے شاندار نکلے اس نے قرآنی معارف کے جاننے والے ایسے فضلاء اور محققین پیدا کئے جن کی تصنیفات اسلامی لٹریچر میں بڑی قدر وقیمت کی حامل ہیں۔ان کے علاوہ دین وملت کی خدمت کے لئے ہر شعبے میں یہ درس گاہ مردِ میدان پیدا کرتی رہی ہے۔مدرسہ

کی سماجی اور علمی خدمات کے بارے میں مولوی عبدالرحمٰن اصلاحی (1975،ص85) رقمطراز ہیں:

> ''تصنیف وتالیف، تحقیق وتنقید، درس وتدریس، تبلیغ ودعوت، انشاپردازی، صحافت، تجدید واصلاح کے میدانوں میں مدرسہ کے فضلاء اور فیض یافتہ اشخاص نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔جن کے ابدی وجاودانی کارناموں کو آنے والا مؤرخ فراموش نہیں کرسکتا۔''

مدرسۃ الاصلاح نے معاشرتی اصلاح کے لئے مسلمانوں کی اخلاقی وروحانی تربیت، عقائد کی اصلاح اور معاشرتی سُدھار، امر بالمعروف نہی عن المنکر کی تربیت کا سامان فراہم کیا۔ گاؤں گاؤں میں تنظیمیں قائم کی گئیں۔شادی بیاہ کی مسرفانہ اور غیر شرعی رسوم کے مٹانے کی کوشش کی گئی۔بدعات ومنکرات کے ازالہ کی تدبیریں کی گئیں۔اور سالانہ جلسے شاندار پیانے پر منعقد کر کے مسلمانوں کی تہذیبی، ثقافتی خدمت سرانجام دی۔

مدرسہ مظاہر العلوم۔سہارن پور

''دارالعلوم دیوبند'' کے عمائدین میں سے بعض بزرگوں نے شہر سہارن پور میں ایک دوسری بلند پایہ دینی وعلمی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔اس درسگاہ کا نام شہرت کے لحاظ سے ''دارالعلوم دیوبند'' کے بعد آتا ہے۔اِس کا نام مولانا محمد مظہر نانوتوی کے نام نامی پر (تھوڑے تغیر کے ساتھ) مظاہر العلوم قرار دیا۔اس دارالعلوم کو عمائدین دارالعلوم دیوبند کی مسلسل سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔اس مدرسہ کی بابت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (1961،ص136) رقمطراز ہیں:

''مدرسہ مظاہر العلوم'' اپنی خصوصیات وروایات، اصول اور عقائد کے لحاظ سے ''دارالعلوم دیوبند'' ہی کا ہم مسلک ہے، یہاں سے بھی بڑی تعداد میں علماء اور علمِ دین کے مخلص خدمت گزار فارغ ہوکر نکلے ہیں۔ جنہوں نے خاص طور پر فنِ حدیث کی بڑی خدمت کی ہے اور یہاں کے اساتذہ وطلبہ اپنے سادہ طرز معیشت اور قناعت اور دینی استقامت میں بہت ممتاز ہیں۔''

دارالعلوم تقویۃ الاسلام۔ امرتسر

امرتسر کی مشہور درس گاہ مدرسہ غزنویہ یا دارالعلوم تقویۃ الاسلام مسلمانوں کے علوم وفنون کے تحفظ وبقا، اسلام کے دفاع اور مسلمانوں کی ملّی زندگی کے تشخص کے اسی تصور کے پیشِ نظر قائم کیا گیا تھا۔ اس درس گاہ کے قیام میں اوراس کے ذریعہ علوم کتاب وسنت کی ترویج واشاعت میں خاندان غزنویہ کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی نے اپنی فراست ایمانی اور بصیرت قلبی کی برکت سے علوم کتاب وسنت اور دیگر علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نام سے 1901ء میں مسجد غزنویہ امرتسر میں درسگاہ قائم کی۔ جو پنجاب میں علمی اور روحانی فیوض کے لحاظ سے عدیم النظیر اور بے مثال تھی۔ مدرسہ غزنویہ سے متعلق سیّد ابوبکر غزنوی (1974، ص450) لکھتے ہیں:

''اس طرح مسجد غزنویہ ایسی تربیت گاہ بن گئی تھی جہاں علم کے ساتھ عمل، قال کے ساتھ حال کی کیفیت اور علم وبصیرت کے ساتھ معرفت کا دَر حاصل ہوتا تھا۔''

مولانا عبدالجبار غزنوی کی وفات کے بعد حضرت عبدالواحد غزنوی اوران کے بعد مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے دارالعلوم کا کام سنبھالا۔ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کا دَور تقویۃ الاسلام کا زریں دَور ہے۔ 1919ء میں تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ 1921ء میں جمعیت علماء ہند کی تشکیل وتاسیس میں مؤثر کردارادا کیا۔ 1927ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ سیّد ابوبکر غزنوی (1974, ص ص455-456) مزید لکھتے ہیں:

> ''ہمارے دینی مدارس میں عام طور پر جماعت بندی کا خیال نہیں کیا جاتا تھا اور نصاب تعلیم پر جمود طاری تھا۔ مولانا داؤد نے اصلاح نصاب، جماعت بندی، عرصہ تعلیم کا تعین، قرآن وحدیث اور فقہ کے علاوہ صرف ونحو، منطق وفلسفہ اور بلاغت وادب کے نصاب میں ضروری تبدیلی کی۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ان کے زمانے میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام از سرنو وجود میں آیا۔''

مدرسہ مظہر العلوم۔ کراچی

دیوبند کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ اسے ممتاز عالم مولوی عبداللہ ابن شیخ عبدالکریم نے 1884ء میں کراچی کے ایک محلّہ کھڈہ میں قائم کیا۔ مولوی عبداللہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد صادق نے سنبھالا۔ مولانا نے خود اسی مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اپنے دَور کے مسلم رہنماؤں، علماء اور قائدین کے دوش بدوش ملک وملت، دین ومذہب اور آزادی کی خاطر ہر اسلامی تحریک میں حصہ لیا۔ مدرسے کے مزاحمتی کارناموں کے حوالے سے پروفیسر معین الدین عقیل (75-1974، ص49) لکھتے ہیں:

''مدرسہ مظہر العلوم کی تاریخ کا سنہری دَور مولانا محمد صادق کا
زمانہ ہے۔ ان کی کوششوں سے یہ مدرسہ سندھ میں تحریک
آزادی، ردّ بدعات، تبلیغ و اشاعتِ اسلام، تعلیم و ترویج علوم
اسلامی اور مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا سب سے بڑا مرکز
بن گیا۔''

اس ادارے کی ادبی خدمات کا ایک امتیازی وصف اس کا کتب خانہ ہے جس میں مختلف علوم وفنون پر تقریباً چھ ہزار نہایت قیمتی نایاب عربی، فارسی، اُردو، سندھی، گجراتی کتابیں موجود ہیں۔ قلمی نسخوں کی بھی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔

مدرسہ دارالرشاد۔ پیر جھنڈا

1857ء کی شکست کا انگریزوں سے بدلہ لینا، قرآن کے فلسفہِ انقلاب پر مسلمانوں کو منظّم کرنا، مولانا عبید اللہ سندھی کی زندگی کا نصب العین تھا۔ مولانا دیوبند سے فراغت کے بعد سندھ تشریف لائے تو انہوں نے ان ہی مقاصد دینی وملّی کے لئے کام شرع کردیا۔ جن کی طرف حضرت شیخ الہند کی تعلیم و تربیت نے رہنمائی کی تھی۔ انہوں نے ان مقاصد کیلئے امروٹ (ضلع سکھر) کو مرکز قرار دیکر ایک انقلابی جماعت تیار کی۔ محمود المطابع کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ عربی اور سندھی کی بعض نایاب کتابیں شائع کیں۔ ہدایت الاخوان کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ مولانا تاج محمد امروٹی جو مولانا سندھی کے سرپرست اور بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے، ناراض ہوگئے۔ مولانا سندھی نے پریس اور رسالہ بند کردیا۔ سیّد ابوتراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مولانا سندھی کو بلاکر گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدر آباد) میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ حضرت پیر راشدی دیوبندی مکتبہءِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت

شیخ الہند سے خاص نسبت رکھتے تھے۔

1901ء میں مدرسہ قائم ہوگیا۔ اس کے مقاصد میں تبلیغ واصلاح کے نقطہ ٔنظر سے تصنیف وتالیف کے کام بھی شامل تھے۔ اس مدرسہ کی خصوصیت بھی تھی جو اور کہیں نظر نہیں آتی۔ مدرسہ میں ''السواد الاعظم'' کے نام سے ایک مجلس افتا قائم تھی۔ جس میں مدرسہ مظہر العلوم کراچی کے اساتذہ بھی شامل تھے۔ اور ان سے فتویٰ لیتے تھے۔ اس مدرسے کی علمی ودینی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر وفا راشدی (1986، ص 211) لکھتے ہیں:

> ''مدرسہ دارالرشاد سے ہزاروں عالمِ باعمل پیدا ہوئے۔ جنہوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں دینی علوم کی تعلیم وتدریس کی مسندیں آراستہ کیں اور اسلام کی تبلیغ، اشاعت کے سلسلے قائم کیے۔ یہ سلسلے نہ صرف سندھ بلکہ بلوچستان، مکران، پنجاب تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا فیضان آج تک جاری ہے۔''

مدرسہ دارالرشاد کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے اساتذہ کی ملک گیر خدمات کے بارے میں ڈاکٹر وفا راشدی (1986، ص 212) مزید لکھتے ہیں:

> ''لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ عدمِ تعاوِن کی تحریک جو خلافت کے زمانے میں کانگرس نے قبول کی ہے وہ مدرسہ دارالرشاد کے ایک دیوبند استاد نور الحق کی تجویز تھی۔''

اسلام کی تبلیغ اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کئے اور اسلام کے دفاع کی

بہترین خدمات انجام دیں۔ مدرسہ مسلمانوں کی اصلاح اور ملک کی تحریک آزادی کا دہلی میں ایک مرکز تھا۔ مدرسہ کی خصوصیات کے ضمن میں اس کی فتویٰ نویسی کی خدمت وامتیاز کا نہ صرف پورے ہندوستان میں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دُور دراز ممالک تک شہرہ پہنچ چکا تھا۔ اس کے تلامذہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مدرسہ امینیہ۔ دہلی

حیدرآباد دکن کے ایک صالح سعید طالب علم امین الدین دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر دہلی پہنچے اور سنہری مسجد (چاندنی چوک) میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ جو مدرسہ امینیہ کے نام سے پورے ملک میں مشہور ہوگیا۔ 1910ء کے بعد مدرسہ کی ترقی بہت زیادہ ہوئی مدرسہ امینیہ نے علوم اسلامی کی تعلیم وتدریس کے علاوہ اسلامی علوم وافکار کی اشاعت میں بھی حصہ لیا۔ مدرسہ کی خصوصیات کے ضمن میں محمد منتظر الدین (1974، ص 64) لکھتے ہیں:

> ''اس کی فتویٰ نویسی کی خدمت وامتیاز کا نہ صرف پورے ہندوستان میں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دُور دراز ممالک تک شہرہ پہنچ چکا تھا۔ اس کے تلامذہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔''

شرقی زبانوں کے اداروں کا کردار

مسلمان شرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وثقافت کی فوقیت کو کسی صورت میں بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے، انہوں نے مدراس (ویلور) سے لے کر بریلی تک انگریزوں سے ٹکر لی اور انگریزوں کے اقتدار کو چیلنج کیا۔

انگریز کی بالغ نظری اور سیاسی سوجھ بوجھ مسلّمہ ہے وہ اس سے پہلے یہاں کے ''طبقہ اشرافیہ'' کو صدر الصدُوری اور عہدہ افتا وقضا دے کر اپنا ہم نوا بلکہ معین و مددگار بنا چکا تھا اور ان کے ذریعہ سے اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ اب بھی اس نے مشرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وثقافت بالخصوص نظریہ جہاد اور دارالحرب کے مسئلے کو ختم کرنے کے لئے تعلیمی اداروں، تہذیبی مجلسوں اور علمی اداروں کا خود بھی جال بچھایا۔ اس کے لئے شرفائے ملت کو تلاش کیا۔ انگریز نے سوچا کہ ہندوستان میں بالخصوص مسلمانوں کو جب تک مغربی علوم وفنون اور جدید تہذیب کی برتری کا احساس نہ دلایا جائے گا اس وقت تک جہاد اور دارُالحرب جیسے مسائل سے چھٹکارا اور مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنا سخت مشکل ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے حکومت نے بعض تعلیمی ادارے اور علمی انجمنیں قائم کیں۔

پنجاب یونیورسٹی کالج

ایک مدّت کی مراسلت اور سعی کے بعد 8 دسمبر 1869ء کو یونیورسٹی کالج کے قیام کا اعلان کر دیا اور کالج کا نام پنجاب یونیورسٹی کالج قرار پایا۔ اور ڈاکٹر لائٹنر کو اس کا پہلا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کے مقاصد میں سے سب سے اہم مقصد خاص علوم وادبیات مشرقی کی تعلیم وتدریس سے متعلق رکھتے تھے۔ نیز مشرقی السنہ (عربی، فارسی، سنسکرت) اور ادبیات کی عمدہ تعلیم کو ہر طرح سے ترقی دینا۔ اس حوالے سے ابوسلمان شاہ جہان پوری (1974، ص 88) لکھتے ہیں:

> ''انگریزی زبان اور ادبیات کی تعلیم کو ہر طرح تقویت دی جائے گی اور جن مضامین کی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعے سے مکمل نہیں ہوسکتی ان مضامین کی تعلیم اور امتحان انگریزی

زبان کے ذریعے سے ہوں گے۔''

یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور

اورئینٹل کالج ایک فانوس ہے جس نے مشرقی علوم وتہذیب کی شمع کو حوادثِ انقلابات روزگار میں بجھ جانے سے بچایا۔ اس ادارے نے ملّت کے عظیم علمی وتہذیبی ورثے کی حفاظت کی اور دنیا میں اسے توقیر بخشی۔ اس ادارے نے مشرقیت کی روح کو زندہ رکھا اور اس کی زندگی کو وقار بھی بخشا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ایک جلسے میں اورئینٹل کالج کا ایک جامع منصوبہ پیش کر کے منظور کروالیا۔ اورئینٹل کالج کی خدمات عظیم بھی ہیں اور ہمہ جہت بھی ہیں۔ اس نے علوم والسنہ، مشرقی علوم کی اشاعت کے فروغ اور ذوق تصنیف وتالیف کی تربیت ہی میں حصہ نہیں لیا بلکہ ذہن وفکر کی تعمیر اور مشرقیت کی روح پیدا کرنے میں بھی حصہ لیا۔ اورئینٹل کالج کی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (1962،ص59) لکھتے ہیں:

> ''اورئینٹل کالج کو اس بات پر فخر رہا ہے اور یہ فخر کچھ بے جا بھی نہیں کہ وہ کم وبیش ایک سو برس سے مشرق کی تہذیبی روایت کا پاسبان رہا ہے جس کا دَورِ محکومی میں مٹ جانا کچھ بعید از قیاس نہ تھا اور اب دور آزادی میں یہ ادارہ ملک وقوم میں اس روایت کی بدولت خود شناسی کا وہ احساس پیدا کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ جس کے بغیر کوئی ملک، ملک کہلا سکتا ہے اور نہ کوئی قوم، قوم بن سکتی ہے۔''

انجمن پنجاب لاہور

21 جنوری 1865ء میں سکشا سبھا کے مکان میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں لاہور کے علم دوست حضرات اور رؤسا شریک ہوئے اور ''انجمن پنجاب'' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن حکومت وقت کے ایماء پر قائم ہوئی تھی ۔ کیونکہ کرنل ھالرائیڈ جو اس وقت پنجاب کے سرشتۂ تعلیم کے منتظم اعلیٰ تھے اُنہوں نے ڈاکٹر لائٹز کو جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اِس انجمن کے قائم کرنے کی ہدایت دی تھی ۔ انجمن کا پورا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' رکھا گیا جو بعد مین صرف انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اس بارے میں سورج بھان (1865، ص15) لکھتے ہیں:

> ''ہم کئی برس سے اِس فکر میں تھے کہ مثل کلکتہ ولکھنؤ اس شہر میں بھی جو دارالسلطنت پنجاب ہے ایک مجلس رئیساں نامی عالم وفاضل شائق علم وہنر کے ایسی مقرر کی جائے کہ جس میں تنقیح مطالب مفیدہ پنجاب وترقی علم وہنر کے تحریراً نیز تقریراً عمل میں آکر بذریعہ چھاپہ خانہ منتشر ہوا کرے۔''

انجمن پنجاب سرزمین ہند میں علوم وتہذیب مشرقی کا وہ صالح بیج تھا جو نشوونما کے ایک مرحلے کے بعد اگرچہ خود ختم ہوگیا لیکن اس بیج سے علمی وتہذیبی روایات کا جو شجر پیدا ہوا وہ گزشتہ سوسال سے نہ صرف سرسبز وشاداب ہے بلکہ ثمر آور بھی ہے اور اس کے فیضان کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے۔ اس انجمن نے تعلیم کے فروغ، علوم وفنون کی ترقی، اور اُردو ادب اور جدید شاعری کے ارتقاء، معاشرتی خرابیوں کے انسداد اور اصلاح رسوم کی تحریک میں بھرپور کردار انجام دیا ہے۔ انجمن پنجاب کے اصلاحی اور سماجی مقاصد کو پورا کرنے میں آزاد اور حالی کی کوششیں سب

سے نمایاں ہیں۔ انجمن کے زیرِ اہتمام مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ اُردو شاعری کو جدید رجحان دینے کا آغاز اِن مشاعروں سے ہوا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (1966، ص 24) لکھتے ہیں:

''مشاعرے کے سلسلے میں مختلف موضوعات پر عنوانات دیئے جانے لگے اور تراجم کے علاوہ ان عنوانات پر طبع زاد نظمیں بھی لکھی جانے لگیں ۔ حالؔی اور آزاؔد اِن مشاعروں کے روحِ رواں تھے۔''

ہندو اہلِ قلم بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مہم میں بھرپور حصہ لینے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو بھی اپنے اور اپنے دین کے تحفظ اور بقا کا خیال آیا۔ انجمن پنجاب کا قیام سماجی، تعلیمی اور سیاسی اصلاح کی خاطر ہوا۔ انجمن کی سرگرمیوں سے متعلق ڈاکٹر مسکین علی حجازی (1997، ص 33) لکھتے ہیں:

''انجمن کی طرف سے ''پبلک کے لئے ایک کتاب خانہ کھولا گیا، اس کتب خانہ'' کے اخراجات چندے سے پورے کئے جاتے تھے۔ اس کتاب خانے میں 1865ء کے آخر تک ایک ہزار چار سو تین کتابیں اُردو، ہندی اور انگریزی کی موجود تھیں۔ چھبیس اخبارات آتے تھے۔ اس انجمن کی ایک تعلیمی کمیٹی تھی۔ جس کا کام یہ ہے کہ ہندوستانی اور دوسری مشرقی زبانوں کی کتابیں شائع کروائے اور اِن زبانوں کی ترویج کے لئے مختلف مقامات پر مدارس قائم کروائے۔''

صحافت کے ضمن میں انجمن پنجاب نے گراں بہا خدمات سرانجام دیں اس کے ذریعے قومی بیداری کا شعور لوگوں میں پیدا کیا گیا۔اخبار انجمن پنجاب کی مزاحمتی خدمات کے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (1996، ص39) لکھتے ہیں:

"اخبار انجمن پنجاب اعلیٰ پائے کے مضامین دیتا تھا، خبریں بھی چھاپتا تھا اور بعض اوقات انگریزی عہد حکومت پر کھلے انداز میں تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔"

اُردو ذریعہ تعلیم کے اداروں کا کردار

بعض اداروں نے اُردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر کے اُردو کی لسانی اہمیت اور افادیت کے اعتراف کیلئے میدان ہموار کر دیا۔ یہ ان اداروں کی بہت بڑی خدمتِ اُردو تھی۔ اگر یہ ادارے وہ علمی و فنی خدمات انجام نہ دیتے تب بھی اُردو ذریعہ تعلیم کے ادارے کی حیثیت سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں اُن کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جاتا۔ اُن میں سب سے پہلا نام دہلی کالج کا تھا۔

دہلی کالج

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق مدرسہ غازی الدین کی ابتدا 1792ء میں ہوئی۔ 1825ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا اور دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ مسٹر ٹیلر کی سفارش پر دہلی کالج قائم کیا گیا اور وہی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے یہاں انگریزی زبان کی حیثیت ثانوی تھی۔ لیکن اہلِ دہلی کے اشتیاق کے پیشِ نظر انگریزی کی جماعتیں علیحدہ بھی قائم کی گئیں۔ دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اِس نے اُردو کے ذریعہ مغربی سائنس،

ہیئت ، ریاضی ، نیچرل سائنس ، فلاسفی ، وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہند میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی ۔ دہلی کالج کی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر صفیہ بانو (1978، ص56) لکھتی ہیں :

> ''اس کالج نے نہ صرف اُردو زبان میں تعلیم کی شان دار روایات قائم کیں بلکہ ایک اور نئی شش جہت پیدا کی۔ تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت ، مشرق ومغرب کا امتزاج اور آزاد نقطہءِ نظر کا اولین احساس اِسی کالج نے پیدا کیا۔ رواجی تصورات سے نجات دلا کر ماضی کا تنقیدی شعور ، حال کا نیا احساس اور مستقبل کی پذیرائی کی ۔ اس کی اوّلیات میں تنقید شعر وادب ، ترجمہ وتاریخ ، سیرت وسوانح ، مضمون نگاری اور صحافت کو اہمیت حاصل ہے۔''

اگر چہ ابتداء میں انگریزی اور مشرقی شعبے علیحدہ علیحدہ تھے لیکن جب مسٹر بروس کا پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہوا تو دونوں شعبوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ۔ دونوں شعبوں کو ملا کر ایک کر دینے کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ ، اخلاقی اور سائنٹیفک مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جائے ۔ مسٹر بروس کا خیال تھا کہ جب موجودہ جدید تعلیم یافتہ نسل کے اساتذہ رخصت ہو جائیں گے اور ان کے جانشین وہ ہونگے جنہوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے تو روشن خیالی بڑھ جائے گی۔ صدیق الرحمٰن قدوائی (1961، ص46) لکھتے ہیں :

> ''1835ء میں ایک مبارک کام یہ بھی ہوا کہ اُردو زبان کی تعلیم وتکمیل کے لئے ''ورنا کیولر سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا۔ مغربی علوم کو اُردو، زبان میں منتقل کرنے کے لئے

قواعد وضوابط بنائے گئے اور مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کو اس
کا نگراں مقرر کیا گیا۔"

ڈاکٹر اسپرنگر چوں کہ عربی زبان سے واقف تھے لہذا ان کی کوششوں کے ذریعہ کالج کے مشرقی شعبے کے طلباء میں یورپین ادب وعلم کا ذوق پیدا ہو گیا اور دونوں شعبے پورے جوش وخروش سے کام کرنے لگے اس سلسلے میں مولوی ڈاکٹر عبد الحق (1959،ص49) بحوالہ مسٹر کارگل لکھتے ہیں:

"مشرقی شعبے کا طالب علم سائنس کی تعلیم میں آگے بڑھ رہا ہے اور کسی طرح اپنے حریف یعنی انگریزی شعبے کی تعلیم ،علم سے پیچھے نہیں ......حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے۔انہوں نے مشرقی شعبے کے طلباء کا امتحان لیا اور ان سے علم ہیئت، جنرل سائنس اور اخلاق اور مذہبی مسائل پر گفتگو کی۔ان سب کا یہ بیان ہے کہ اس شعبے میں قطعی طور پر بہت ترقی پائی جاتی ہے۔"

نئی روایات واقدار کے بدلنے میں دہلی کالج نے سماجی ادراک رکھتے ہوئے اُردو زبان وادب کے ارتقاء میں اہم ترین حصہ لیا۔ یہاں نئے ذہنی رجحانات اور مغربی فکر وفلسفہ پروان چڑھے۔سیاسی اعتبار سے افادیت پسندی نے اساتذہ وطلباء کے طرز فکر کو بدل ڈالا۔علم وفن،شعر وادب،صنعت وحرفت غرض ہر شے کے پیچھے مفید مقصد تلاش کیا گیا تعلیم کا مقصد معاشی فلاح کے علاوہ سماجی اصلاح بھی بن گیا اور لوگ ادب میں مقصدیت کی اہمیت سے واقف ہو گئے دہلی کالج میں ان اصلاحی نظریات کے فروغ کے ساتھ اس کی نشوونما بھی ہوئی۔اسی وجہ سے دہلی کالج کے زیر

اثر تخلیق ہونے والے ادبی رجحانات کی تاریخی اہمیت ہے اور جسے نظر انداز کر کے جدید اُردو نثر کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ ماسٹر رام چندر، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، پیارے لال آشوب، صہبائی، کریم الدین جیسے مشہور و معروف بزرگ اسی کالج کے طالب علم تھے، جنہوں نے نہ صرف اُردو زبان کو نئے فکر و نظر عطا کئے بلکہ اپنی گراں قدر تصانیف سے اُردو زبان میں گنجِ گراں مایہ کا اضافہ کیا۔

جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن

دکن کے امراء میں نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے خاندان کی خدمات کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ 1856ء کو ان کی ڈیوڑھی واقع ''پتھر گئی'' میں مدرسہ دار العلوم جامعہ عثمانیہ کی ابتداء ہوئی۔ پہلے سال وہاں طلباء کی تعداد 130 ہو گئی۔ چند سالوں میں مدرسہ نے جامعہ کی صورت اختیار کر لی۔ ''درسِ نظامیہ'' کی طرز پر وہاں تعلیم اعلیٰ مدارج تک دی جانے لگی۔ قیام جامعہ کے وقت سے ہی اس میں سائنس اور فنون کے شعبوں میں تعلیم دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ دینیات کا شعبہ علیحدہ تھا۔ تعلیمی شعبے ریاضی، انگریزی، تاریخ اسلام، تاریخ یورپ، معاشیات، فلسفہ و منطق، طبعیات، کیمسٹری، عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، مرہٹی، کڑی، تلنگی پر مشتمل تھے۔ دینیات کے شعبہ کے تحت حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ قدیم، منطق اور عربی ادب کی تعلیم دی جاتی۔ جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ کی ایک خاص اہمیت ہے جو مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی لحاظ سے جامعہ عثمانیہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس بارے میں عرشیہ شفقت رضوی (1974، ص 123) لکھتی ہیں:

> ''جامعہ عثمانیہ نے ایک قلیل مدت میں ثابت کر دیا کہ اُردو
> ذریعہ تعلیم سے فارغ التحصیل طلباء اور کارگزاری کے اعتبار
> سے دنیا کی کسی یونیورسٹی سے پیچھے نہیں اور یونیورسٹی کی تعلیم

حاصل کر کے جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے دنیا کے کسی ملک میں
بھی جاتے ہیں تو زبان ان کے مقصد میں رکاوٹ ثابت نہ
ہوئی۔ اُردو میں پڑھنے والوں نے دنیا کی کسی یونیورسٹی سے
اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے وہاں کے معیار کی بلندی کا لوہا
منوالیا۔''

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

اسلامی علوم اور ملّی مقاصد کو فروغ دینے کے واضح مقاصد کے ساتھ یہ جامعہ قائم ہوئی تھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ جلد ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا نامعقول اور غلامانہ طریقہ ترک کر دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم تک اُردو کو ہی ذریعہ تعلیم رکھا۔ نقاشی اور حرفتی تعلیم کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ تاکہ طلباء آزاد پیشہ اختیار کر سکیں۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ اپنا ایک مجلّہ ہر ماہ ''جامعہ'' کے نام سے شائع کرتی تھی جس میں ثقافت تعلیم، سیاست، تاریخ، سوانح اور دیگر علمی موضوعات مضامین شائع کرتی تھی۔ جامعہ کی دینی، تہذیبی، اور تعلیمی جد و جہد اور ملّی بقاء کے جذبے پر محمد علی جوہر (1921، ص35) اظہار خیال کرتے ہیں:

''اس طرح پہلی مرتبہ علم دین اور دنیا ایک ہی چھت کے نیچے
جمع ہونگے جس سے بلا شبہ دونوں منفعت پذیر ہونگے اور
مغائرت کا وہ پردہ جو دونوں کے درمیان حائل ہے اور جس
نے علم دین کو بے حس علم اور علم دنیا کو بے روح اور دُور از خدا
بنا رکھا ہے اُٹھ جائیگا۔''

جامعہ ملّیہ کی مزاحمتی خدمات میں کئی پہلو نمایاں تھے۔ اُن میں سے ایک قومی غیرت اور دوسرا ثقافتی تحفظ تھا۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو سرکاری مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے فارغ التحصیل طلباء پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ جامعہ نے ملّی غیرت کی خاطر سرکاری امداد کو ٹھکرا دیا۔ جس کے بارے میں شیخ محمد اکرام (1975، ص ص 146-145) رقمطراز ہیں:

''سرکاری گرانٹ کی خاطر ملّی غیرت کو ہرگز داؤ پر نہ لگایا۔ جامعہ کی شروع ہی سے یہ پالیسی بنائی گئی تھی کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت سے ہی کرے گی اور ملکی سیاست سے الگ رہے گی۔''

ثقافتی تحفظ کے پیشِ نظر جامعہ نے اپنے قومی زبان کا تحفظ ضروری مقصد قرار دیا۔ اس ادارے نے ذریعہ تعلیم اُردو کی خاطر اپنا مزاحمتی کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے شیخ محمد اکرام (1975، ص 153) مزید لکھتے ہیں:

''جامعہ کا ایک بہت بڑا کام اُردو کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنانا ہے۔ اس سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی اُردو ذریعہ تعلیم رائج تھا لیکن جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی نے اعلیٰ تعلیم کی سند حاصل کرنے کے لئے کسی مقامی زبان میں کتاب لکھنے کی شرط رکھ کر اُردو زبان کو مزید فروغ دیا۔''

جامعہ ملیہ نے سکولر تعلیم کو بنیادی طور پر غلط قرار دیا۔ اسی طرح سکولر تعلیم میں محض دینیات کے اضافے کو بھی ناکافی سمجھا۔ اس کے بانیوں نے یہ تصور پیش کیا کہ تعلیم کو علومِ جدیدہ اور دین کا جامع ہونا چاہیئے۔ اور طالب علم کو بیک وقت دونوں میں مہارت ہونی چاہیئے۔ قرآن پاک اور سیرت نبوی کے مطالعہ کو جزو نصاب بنایا گیا۔ انگریزی کی بجائے جامعہ نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔

یہ مسلمانوں کا جدید تعلیم کا واحد ادارہ ہے جس نے حرفی تعلیم کے ذریعے معاش کے آزاد ذرائع کا بندوبست کیا جامعہ مختلف حیثیتوں سے ایک بڑا کامیاب رہا، لیکن یہ بھی قومی زندگی پر اپنے ہمہ گیر اثرات نہ ڈال سکی۔ پروفیسر خورشید احمد (1977، ص10) اس طرح اظہار کرتے ہیں:

''فکر و نظر کا یہ تناقض اس کی پیش قدمی میں حائل ہوا اور یہ تجربہ اپنے صحیح رنگ میں نہ ہو سکا۔''

الغرض جامعہ نے بیک وقت اسلامی اخوت اور متحد قومیت کا راگ الاپا۔ بنیادی تضاد کو آخر تک بھی محسوس نہ کیا۔

مدرسہ طبابت۔حیدر آباد

برصغیر میں طب مغرب (ایلوپیتھی) کی تعلیم و تربیت کا یہ سب سے پہلا مدرسہ ہے۔ اس کا اجراء 1845ء میں آصف جاہ رابع (ناصر الدولہ) کے دَور میں حیدر آباد دکن میں ہوا تھا۔ اس کے نگراں اور کئی اساتذہ انگریز تھے۔ ڈاکٹر میکلین جارج اسمتھ، ڈاکٹر وِنڈ وغیرہ بعد میں اسی مدرسے کے مستندین میں سے مقامی حضرات بھی یہ خدمت سرانجام دینے لگے تھے۔ اس مدرسے کی خصوصیت کے حوالے سے حکیم سیّد محمود احمد برکاتی (75-1974، ص265) لکھتے ہیں:

''ایک اہم خصوصیت اس مدرسے کی یہ تھی کہ اس میں ذریعہ تعلیم اُردو تھی۔ انگریز اساتذہ بھی اُردو میں درس دیتے تھے۔''

اس مدرسے کی طرف سے اسکول میگزین کے طور پر اُردو میں ایک رسالہ بھی 1855ء کے اواخر سے شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کا نام رسالہ ''طبابت'' تھا۔ اس کے مدیر جارج اسمتھ

تھے۔ یہ رسالہ اُردو کا پہلا جریدہ تھا۔ اس مدرسہ کے مستندین نے جنوبی ہند میں بڑا نام اور مقام پیدا کیا اور طب مغرب پر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ اس ادارے کی یہ دینی اور تہذیبی خدمت اس کے تعلیمی کردار کی عکاس ہے۔ جو اس نے جنوبی ہند میں سرانجام دیا۔

تعلیمی اور ادبی انجمنوں کا کردار

1857ء کے بعد ملک میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے وہ درحقیقت مختلف تعلیمی تحریکوں کا نتیجہ تھے۔ اس سلسلے میں جس تحریک نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ سرسیّد کی تعلیمی تحریک تھی۔ سرسیّد نے کئی چھوٹی بڑی انجمنیں بنائیں لیکن ان سب میں زیادہ شہرت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ملی۔ علی گڑھ کالج تو سرسیّد کی تعلیمی تحریک کا نتیجہ تھا۔ کانفرنس نے پورے مُلک کے مسلمانوں میں ایک تعلیمی تحریک پیدا کر دی۔ مُلک کے مختلف علاقوں میں انگریزی تعلیم کے متعدد مدارس قائم ہوئے اور انجمنیں بھی۔ تعلیمی انجمن کی حیثیت سے انجمن حمایت اسلام نے سب سے زیادہ عزت پائی۔ برصغیر کی چند مشہور انجمنوں کا مختصر سا تعارف اور تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

انجمن حمایتِ اسلام

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کے قدم جوں جوں جمتے گئے ان کی تبلیغی سرگرمیاں بھی بڑھتی گئیں۔ لیکن 1857ء کے انقلاب کے بعد تو عیسائی مشنریوں کا ایک سیلاب تھا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس دَورِ ابتلاء میں حکومت واقتدار کے چھن جانے اور انگریزی حکومت کا معتوب ہونے کے باوجود علمائے دین نے جس پامردی کے ساتھ عیسائی مبلغوں کا مقابلہ کیا اور اسلام کے خلاف ان کی یاوہ گوئیوں کا جس طرح تحریری وتقریری طور پر جواب دیا وہ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی، ثقافتی اور علمی تاریخ کا نہایت شاندار باب ہے۔ پنجاب میں

جن لوگوں نے اس فتنے کا مقابلہ کیا اور دفاع اسلام کا فرض انجام دیا اس میں ''انجمن حمایتِ اسلام'' قابل ذکر ہے۔ اس انجمن نے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور تہذیبی قدروں کی حفاظت کو اپنا مقصد اولین بنایا۔ اور عیسائیت کے لئے رسالے، مضامین اور کتابیں لکھ کر مشنری اداروں کا مقابلہ کیا۔ مدرسے کھولنے کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ لاہور میں مسلمانوں کے لئے دس مدرسے قائم کئے گئے جن میں قرآن اور دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دُنیوی امور کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ انجمن حمایت اسلام ہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں عام ہنگامہ آرائی سے الگ تھلگ رہ کر قوم کی تعمیری سرگرمیاں نشو ونما پا رہی تھیں۔ اس ضمن میں محمد حیات خان (سن ندارد، ص 23) لکھتے ہیں:

> ''انجمن حمایت اسلام شمالی ہندوستان میں وہی کام سرانجام دے رہی تھی جو سرسیّد نے تحریک علی گڑھ کے ذریعے انجام دیا۔ البتہ یہ امتیاز ضرور تھا کہ انجمن متوسط طبقے اور عوام سے زیادہ قریب تھی۔''

1886ء میں مدرسۃ المسلمین کے نام سے لڑکوں کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ میں اُردو، فارسی، انگریزی زبانوں کے ساتھ تاریخ۔ جغرافیہ حساب وغیرہ فنون بھی پڑھائے جاتے تھے۔ انجمن کی روز افزوں شہرت نے کام کیا یہ مدرسہ کالج کا روپ دھار گیا۔ اس کے بعد 1939ء میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے انجمن نے اسلامیہ کالج برائے خواتین قائم کیا۔ انجمن کے ان تعلیمی اداروں میں طلباء کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بے آسرا، بے وسیلہ، اور معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی خواتین کے لئے آبرومندانہ اور دین وایمان کے ساتھ زندگی گزارنے اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے مدد دینے کا انتظام ''دارالامان'' کے ذریعے کیا گیا۔ دارالشفقت کے نام سے لڑکوں اور لڑکیوں کے دو یتیم خانے الگ الگ قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ ملّی دارالاطفال بھی قائم کیا۔ رسالہ حمایت اسلام نے انجمن کی علمی، ادبی، صحافتی، سیاسی اور دینی

خدمات سرانجام دیں۔اس کے حوالے سے محمد حیات خان (سن ندارد،ص25) مزید رقمطراز ہیں:

''انجمن حمایت اسلام نے علمی میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔تاریخ،سوانح،سیرت،تعلیم،تہذیب،ثقافت وغیرہ پر بلند پایہ تصانیف شائع کیں۔انجمن کا مطبوعہ قرآن حکیم اپنی مثال ہے۔انجمن کا ایک اشاعتی ادارہ بھی ہے۔ ایک کتب خانہ بھی ہے۔برصغیر پاک وہند کے تمام مسلمان اکابر نے انجمن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔''

انجمن اسلام۔بمبئی

علاقہ بمبئی میں اُردو تعلیم اور اسلامی تہذیب وثقافت کے فروغ کی تاریخ اور تصنیف وتالیف کی تحریک کا آغاز اسی وقت سے ہوتا ہے جب یو پی، پنجاب وغیرہ مختلف اطراف ہند میں علوم وفنون اور اُردو زبان وادب کی ترقی کی تحریک شروع ہوئی۔مسلمانوں نے بمبئی میں تعلیم کے فروغ،اُردو زبان کی ترقی واشاعت،ادبی ذوق کی تربیت اور تصنیف وتالیف کا شوق پیدا کرنے میں حصہ لیا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے 1894ء میں ''دی اُردو لٹریچر پروموٹنگ سوسائٹی'' قائم کی گئی۔مسلمانوں میں علمی،تعلیمی سماجی، سیاسی بیداری پروموٹنگ پیدا کرنے میں جو کارنامے انجمن اسلام نے انجام دیئے ہیں۔ان کا مقابلہ بمبئی پریسیڈنسی کا کوئی دوسرا ادارہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ انجمن اسلام کی مذہبی،تعلیمی اور معاشرتی خدمات کے حوالے سے سیّد حامد علی (75-1974،ص160) لکھتے ہیں:

"انجمن اسلام نے بمبئی میں وہی کام کیا جو علی گڑھ تحریک چلانے والوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کیا تھا۔ بمبئی کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کا سہرا انجمن اسلام ہی کے سر ہے۔ یہی وہ پہلا ادارہ ہے جس نے تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی پشت پناہی کی، بلکہ اس نے مسلمانان بمبئی اور حکومت بمبئی کے درمیان رشتہ تعلق کو بھی استوار کیا۔"

انجمن الاصلاح۔کلکتہ

یہ انجمن 1902ء میں قائم ہوئی۔ مولوی امجد علی بانکی پوری اس کے صدر اور مولوی احمد حسن اس کے سیکرٹری تھے۔ علمی مذاق کو ترقی دینا، عام اتحاد وائتلاف پیدا کرنا، تقریر و تحریک کے ذوق کو ترقی دینا۔ اصلاح رسوم وغیرہ اس انجمن کے مقاصد تھے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک قرأت خانہ یا دارالاخبار، اور کتب خانہ قائم کیا گیا۔ ہفتے وار جلسے منعقد کرائے جاتے تھے۔ علمی وادبی موضوعات کے علاوہ لوگوں کی دلچسپی کے موضوعات پر تقاریر ہوتی تھیں۔ لوگ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے زبانی تقریر کرتے تھے۔ انجمن اصلاح کی تہذیبی اور تعلیمی ترقی کے حوالے سے پروفیسر سیّد منظور حسین شاہ (1975، ص 153) لکھتے ہیں:

"کلکتہ میں فی الحقیقت ایسی صحبت بالکل ناپید تھی۔ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں علمی ذوق رکھنے والے اکٹھے ہوں اور علم وفن کا چرچا ہوسکے۔ اخبار بینی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے اس کلب کے قائم ہوجانے سے واقعی ایک بڑی ضرورت پوری ہوگئی۔"

انجمن موئید الاسلام ۔ دہلی

یہ انجمن 1893ء میں قائم ہوئی تھی اس کے بانی منشی محمد کرم اللہ خان رئیس دہلی تھے۔ خان بہادر اور مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی بھی اس کے کاموں میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کے اغراض و مقاصد کے بارے میں پروفیسر سیّد منظور حسین شاہ (1975، ص 154) لکھتے ہیں:

> ''اس انجمن کے اغراض مسلمانوں کے لاوارث بچوں کو پرورش کرنا اور ان کو دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم دینا۔ لاوارث محتاج کی میت کی تجہیز و تکفین کرنا۔ ویران مسجدوں کو آباد کرنے میں حتی الامکان سعی کرنا۔''

اس انجمن کے زیر اہتمام ایک یتیم خانہ اور مدرسہ بھی قائم ہوا۔ مسلمان لاوراث اور یتیم لڑکے اور لڑکیاں پرورش پاتے تھے۔ اور انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے باعزت زندگی کا سامان کیا جاتا تھا۔

انجمن ہدایت اسلام ۔ دہلی

یہ انجمن اسلام کی اشاعت ودفاع کے لئے مبلغین تیار کرتی تھی۔ انہیں اسلامی عقائد وعبادات کا فلسفہ اور علم کلام و منطق بھی پڑھائی جاتی تھی اور غیر مسلموں سے مناظرہ ومباحثہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس انجمن نے اسلام کی تبلیغ اور دفاع کا فریضہ نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ انجمن نے ملک کے مختلف علاقوں میں اپنی شاخیں قائم کیں اور ملک کے چپے چپے میں اپنے مبلغین کو پھیلا دیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اس کی شاخوں کی تعداد چوبیس بتائی ہے۔ اس انجمن کی خدمات کے بارے میں ابوسلمان شاہ جہان پوری (74-1973، ص 155) اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ انجمن غیر مذہب والوں خصوصاً آریہ سماجیوں کے حملوں کے جواب میں مناظرہ کرتی اور مناظرانہ رنگ کی کتابیں اور رسالے شائع کرتی ۔ یہ انجمن بیسویں صدی کے اوائل میں موجود تھی ۔ اوراس کا مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی کردار قابلِ رشک ہے۔''

مزاحمت کے نتائج

1857ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین ومذہب اوران کی قومی زندگی کی بھی خیرنہیں ۔ کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی ہے اوراس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر ونفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدودنہیں رہتا بلکہ وہ ان کے دلوں اوردماغوں کو بھی تسخیر کرلیتی ہے۔

ہندوستان کے بیدارمغز مسلمان اربابِ فکر وعلم نے اس خطرہ کا اسی وقت احساس کرلیا اور اس کا سدِّ باب کرنے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی ۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے باوصف خود اربابِ فکر میں دو طبقے ہوگئے ۔ ایک قدیم ، دوسرا جدید، ان دونوں قسم کی تعلیم کے لئے درس گاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں ۔ اگر چہ یہ دونوں قسم کی درسگاہیں مسلمانوں کی تھیں اوران کی ، کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں ۔لیکن ان دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک پیدا ہوگئی ۔اس رقابت ونفرت کے بارے میں مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی (سن ندارد، ص 6) لکھتے ہیں :

''قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ، قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا، یہ صورت حال ایک عرصہ تک قائم رہی۔''

نظامِ تعلیم میں دوعملی اثرات کے طور پر بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ہم وحدت افکار اور وحدت کردار سے محروم ہوگئے۔ ان دومتوازی تعلیمی نظاموں کے متعلق پروفیسر بختیار حسین صدیقی (1983، ص125) رقمطراز ہیں:

''ہماری قومی وحدت کا شیرازہ بکھر گیا اور ہم ''مسٹر اور مولانا'' کے دومتحارب طبقوں میں بٹ گئے۔ جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔''

جہاں تک تعلیم کی اشاعت اور جدید علوم وفنون کے فروغ کا تعلق ہے۔ بلا تخصیص دونوں قسموں کے اداروں نے خدمات انجام دیں۔ جس سے مسلم ہندوستان میں یکے بعد دیگرے چار تعلیمی تحریکوں نے جنم لیا۔ دیوبند، علی گڑھ، ندوۃُ العلماء، جامعہ ملّیہ، پہلی نے ثقافتی عصبیت کو فروغ دینے کا فیصلہ کیا اور دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ دوسری نے ثقافتی اثر پذیری کا راستہ اختیار کیا اور مغربی علوم کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں بنیاد رکھی۔ ایک نے قومی ثقافت کے تحفظ کا اہتمام کیا، دوسرے نے معاشرتی تغیر کے لئے راہ ہموار کی۔ قدیم طرز کے مدارس کی مزاحمت کے نتائج کے سلسلے میں ابوسلمان شاہ جہان پوری (1974، ص17) لکھتے ہیں:

''قدیم طرز کے مدارس اسلامی علوم وفنون کے تحفظ کا سبب بنے۔ لیکن ایک بہت زیادہ قابلِ قدر بات یہ تھی کہ یہ مدارس برٹش استعمار کے خلاف سیاسی تربیت گاہوں کی حیثیت رکھتے تھے۔''

1857ء کے ہنگامہ کے بعد جملہ بزرگانِ دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے۔ چنانچہ انگریزی نظامِ تعلیم کے مقابلے میں دیوبند کے علاوہ بانی دیوبند نے جگہ جگہ پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور مزاحمت اختیار کی۔ جس کے نتیجے میں سیّد محمد محبوب رضوی (1954، ص17) لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقا و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔''

تاہم دیوبند میں بعض پہلو نظرانداز ہو گئے۔ مثلاً جامعہ قرطبہ میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فلسفے اور سائنس کی بھی تعلیم دی جاتی تھی لیکن ارباب دیوبند نے آفاق کے مشاہدے کے لئے رصدگاہ اور تجربہ گاہ تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس طرح عباسی دور میں ہم نے یونانی فلسفے کو اسلامی نصاب میں شامل کیا۔ اگر ارباب دیوبند مغربی علوم کو اپنے نصاب میں جگہ دیتے تو شاید تعلیم و تدریس کے لحاظ سے ہماری قومی وحدت قائم رہتی، ہم ''مسٹر اور مولانا'' کے متحارب گروہوں میں نہ بٹتے اور برصغیر پاک و ہند کا تعلیمی نقشہ آج کچھ اور ہوتا اور علی گڑھ کالج کے کھلنے کی نوبت ہی نہ آتی جس نے برصغیر کے تعلیمی نقطہ نظر کو یکسر بدل ڈالا۔ دارالعلوم علی گڑھ کے بانی سر سیّد احمد خان ایک دانشور سے زیادہ مصلح تھے۔ فکر و عمل کے مابین قریبی ربط نے ان کو شخصیت کی جلا بخشی۔ اس کی اس عملی تحریک کے مثبت مزاحمتی نتائج سے علی گڑھ مسلمانوں کا مرکز بن گیا۔ جس کے متعلق قاضی جاوید (1998، ص18) لکھتے ہیں:

''سر سیّد احمد خان کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام تھا۔ جسے بعدازاں یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں اس درسگاہ نے برصغیر کے

مسلمانوں کے اہم ترین تعلیمی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔''

قدیم دینی اداروں کے بالمقابل جدید ضروریات اور عصری تقاضوں کے پیشِ نظر مسلمانانِ ہند نے یونیورسٹیاں بھی قائم کیں۔ جن کا مقصد مسلم طالب علموں کو جدید علوم وفنون سے روشناس کرانا۔ انگریزی حکومت سے اپنا حق وصول کرنا اور بہتر سطح پر حق رائے دہندگی حاصل کرنا تھا۔ ان اداروں کے قیام میں مسلمانوں نے جس قدر تن من اور دھن سے کام کیا اور قربانی اور ایثار کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ راجہ طارق محمود (1958، ص362) رقمطراز ہیں:

''ان جدید یونیورسٹیوں کا قیام مسلم نوجوانوں کو جدید علوم اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم اور سرکاری دفتروں میں کام کرنے اور ملک کی زندگی اور نظم ونسق میں پورا پورا حصہ لینے کے لئے تیار کرنے کا مقصد عمل میں آیا تھا۔ ان طالب علموں کو جدید تعلیم یافتہ ہونے کی بناء پر حکومت کی نگاہ میں اعتماد و وقعت سے دیکھا جانے لگا۔ اور یہی طالب علم بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔''

جدید تعلیم کے فروغ سے مسلمانوں میں بیداری، آزاد خیالی اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ یورپ کے تمدّن کی اصل بنیاد یہی تنقید ہے۔ اس بیداری کو حصول پاکستان کا ذریعہ گردانتے ہوئے شبیر احمد (1974، ص548) لکھتے ہیں:

''اس ملک کے حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کے بچے بچے نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریتی فرقے کی کثیر تعداد اور فرنگیوں کی قوت ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی اور وہ اپنے خوابوں کے وطن کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''

علی گڑھ نے صرف مادی ترقی پر توجہ دی۔ روحانی تموّل اور مادی ترقی دونوں میں توازن قائم کر کے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں اُمتِ وسطیٰ بنانے کی کوشش میں ایک تیسری تعلیمی تحریک وجود میں آئی جس کا نام ندوۃُ العلماء ہے۔ یہ بھی ایک مزاحمت تھی۔ جس کے نتائج کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اسلام (1974،ص110) لکھتے ہیں:

''ندوۃ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔ قرآن شریف کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا۔ اور مسلمانوں کے قانون وقف ومیراث کے متعلق پیچیدہ مسائل پیش آتے ان پر روشنی ڈالی۔''

مسلمانوں کے لئے جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی خدمات کا تذکرہ پروفیسر خورشید احمد (1977،ص91) کرتے ہیں:

''جامعہ ملّیہ کی ایک اور خصوصیت صنعت وحرفت کی تعلیم ہے۔ جامعہ مسلمانوں کا جدید تعلیم کا واحد ادارہ ہے۔ جس نے تعلیم کا رشتہ معیشت سے جوڑا اور حرفی تعلیم کے ذریعے معاش کے آزاد ذرائع کا بندوبست کیا۔''

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی نئے نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا، ہمیشہ اس کے خلاف نت نئے انداز سے مزاحمت کرتا رہا۔لیکن یہ کوششیں زیادہ مؤثر نہ ہوسکیں اور ریاست کی ساری قوتوں کے ساتھ جو انقلاب برپا کیا جارہا تھا۔ اس کا راستہ نہ روکا جاسکا کچھ تو اس نئے سیلاب میں برضا ورغبت بہہ گئے اور کچھ مجبوری سے، لیکن اپنے کوسنبھالنا سب کے لئے مشکل ہو گیا۔

سیلاب کے اس دھارے میں دیوبند نظام نے اپنی حد تک اُمت کے مزاج کو بگڑ جانے سے بچایا ہے اور انگریز حکمرانوں اور بیرونی تہذیب کے مقابلے میں مزاحمت، مصالحت کی بجائے مقاومت اور ٹکراؤ کا علم بلند کیا ہے۔ جسے منفی مزاحمت کا نام دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ گروہ کوئی انقلابی اقدام کرنے سے اپنے آپ کو معذور پاتا تھا اور صرف اپنے علمی سرمایے کو جس حد تک محفوظ کرسکتا تھا، کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک فاعلانہ نہیں، منفعلانہ ردّعمل تھا جبکہ دوسری طرف سر سیّد احمد خان کی تحریک علی گڑھ کا سب سے اہم پہلو مثبت مزاحمتی نوعیت کا ہے۔ جس نے نئی تعلیم کو قبول کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ جس حد تک اس میں اسلامیات کی پیوندکاری کرسکیں، لیکن بحیثیت نظام کے نئی تعلیم کو ہی قبول لیں یہ ردّعمل بھی منفعلانہ تھا، لیکن ایک دوسری نوعیت کا، اوّل الذکر گروہ مقاومت کا روش اختیار کئے ہوئے تھا اور آخر الذکر مفاہمت کی۔ اِن میں اِن تمام علمی اور ادبی تعلیمی اداروں کی مثبت اور منفی مزاحمت کا عکس نمایاں ہے۔ اِن تعلیمی اداروں کے مابعد اثرات آج بھی ملک کے طول وعرض میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کو جو تعلیمی مسئلہ درپیش ہے۔ وہ دراصل اسی تاریخی صورت حال کا پیدا کردہ ہے۔ ہم ایک ایسے نظامِ تعلیم میں گھرے ہوئے ہیں، جو ہماری تاریخ، ہماری ثقافت، ہمارے مذہب، ہماری ملکی ضروریات، ہمارے ادب ہماری روایت، ہر ایک کے لئے چیلنج ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ تعلیمی نظام کے کسی ایک پہلو کی نہیں، پورے نظام کی اصلاح ہے۔ اس کے مقاصد، اس کے اصولِ تنظیم، اس کے نصاب، اس کا طریق تدریس، اس کا ماحول، غرض ہر چیز انقلابی تغیر وتبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب تک تخریب وتعمیر کا یہ عمل بروئے کار نہ آجائے

ہماری ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور ہماری تاریخ کے تقاضے تشنۂ تکمیل رہیں گے۔

حاصلات

- برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کے اجزاء اسلامی نظامِ تعلیم سے متضاد تھے ان میں ارتباط کم بلکہ بُعد زیادہ تھا۔ انگریزوں کو اس ملک کی تعلیم سے کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی۔ صرف یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ مغربی فنون اور مغربی سائنس اور مغربی فلسفہ وآداب کی ترویج کی جائے۔
- انگریزوں کے نظام تعلیم کے اس نظام کے نفاذ سے یہاں کا نظام تعلیم دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک سکولوں اور کالجوں میں انگریزوں کا جاری کردہ اور دوسرا مسجدوں سے ملحقہ دینی مدارس۔
- اس پورے دَور میں کوئی تعلیمی منصوبہ کارفرما نظر نہیں آتا۔ کسی موقع پر بھی ملک کی تعلیمی ضروریات کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ شعبہ تعلیم میں نگاہ صرف وقتی مسائل پر رہی۔ کسی معاملے میں دُور اندیشی نظر آتی ہے تو وہ صرف یہ کہ مشرقیت کا ہر رنگ مٹ جائے اور مغربیّت کا رنگ چڑھ جائے، اس سے ہٹ کر اصل تعلیمی معاملات میں نہ منصوبہ بندی ہے، نہ دُور بینی، نہ معاملات کا شعور ہے نہ مسائل کا فہم ہے، اور نہ تنظیم کے ساتھ کوشش، اور نہ جدوجہد کی مثال ملتی ہے۔
- جو بات اس نئی تعلیم کے حق میں زیادہ سے زیادہ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں مغربی فکروادب تک رسائی ہوئی' مغرب کے اصولِ تنقید کی روشنی میں مشرقی علوم کا ازسرِ نو مطالعہ شروع ہوا۔ طباعت وصحافت نے ایک حد تک ترقی کی۔ ہندوؤں اور مسلمان دونوں میں آزادخیالی، بیداری اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔
- مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے انگریزوں کا دَور سب سے زیادہ تلخ، تباہ کن اور مضرت رساں تھا۔ اس میں کوئی شک کہ اس تعلیم میں اصل ہدف مسلمان ہی تھا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ انگریز اپنی چال میں کامیاب رہا اور اس نے محض تعلیم ہی کو تباہ نہ کیا' بلکہ نئی نسل کے ذہن اور فکر کو

بھی بگاڑ دیا۔

- برطانوی نظام تعلیم کے خلاف مسلمانوں کے ردِّ عمل میں یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی نئے نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمیشہ اس کے خلاف نت نئے انداز سے مزاحمت کرتا رہا۔

- برصغیر میں مسلمان نئے تعلیمی نظام کے خلاف مزاحمتی حصار قائم کرنے کے لئے فکر مند تھے۔ ان کے نزدیک نظامِ تعلیم میں عرفانِ خدا کا تصور نہیں، منزلِ مقصود متعین نہیں اور معنوی بصیرت کا سرے سے فقدان ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے انگریزی نظام کے خلاف مزاحمت کی یہ صورتیں اختیار کیں، انگریزی نظام تعلیم کی مکمل طور پر مخالفت کی، انگریزوں کے نظام تعلیم کے مثبت پہلوؤں کو اپنانا، انگریزوں کی عظیم سیاسی قوت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مصالحت سے کام لینا۔

- شرقی زبانوں کے اداروں، اُردو نواز اداروں میں تہذیبی کوششوں کے حوالے سے مسلمانانِ برصغیر کی مذہبی اور تعلیمی خدمت کو اپنا شعار جانا اور کسی سے بھی کم نہ رہے۔ ان اداروں کے قائدین نے انگریز کی دُور اندیشی کو سمجھا اور اپنے اداروں میں قدیم اور جدید تعلیم کو ہم آہنگ کر کے اپنی اسلامی قدروں کو محفوظ کیا۔

- مزاحمت کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ برصغیر کے طول وعرض میں دینی مدارس معرض وجود میں آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تحصیل کے لئے مسلمانوں نے جدید مدارس قائم کر کے مسلمانانِ برصغیر کو سیاسی شعور کی نعمت سے نوازا۔ دارالعلوم دیو بند، مدرسۃ العلوم علی گڑھ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ اور ندوۃُ العلماء جیسے مزاحمتی ادارے وجود میں آئے۔ ان اداروں نے مسلمانوں کے تنِ مردہ میں علم کی روح پھونکی۔ یہ اُن علمی تحریکات کا ثمر ہے کہ ہم آج ایک آزاد ملک میں آزادی کا سانس لے رہے ہیں۔

- ان اداروں کے مابعد اثرات سے انکار نہیں۔ برصغیر کے کونے کونے میں ان اداروں کے

ذیلی مدارس دینی اور تہذیبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔جن کی تفصیل مقالہ ہذا میں دی گئی ہے۔ کچھ اداروں کی فہرست ضمیمہ کی صورت میں دی گئی ہے۔

باب ششم

خلاصہ اور سفارشات

خلاصہ

اس تحقیق کا مقصد برطانوی عہد میں مسلمانوں کے مزاحمتی تعلیمی اداروں کے دینی اور تہذیبی کردار کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ کرنا تھا۔ اوران دینی اداروں کی مزاحمت کوتہذیب، مذہب اور تعلیم کے حوالے سے روشناس کرانا تھا تاکہ ''مسٹر اور مولانا'' میں منقسم دو متحارب گروہوں کے درمیان بُعد کم ہو اور دینی مدارس میں نصاب، طریقہ تدریس اور نظام جائزہ کی تعمیر نو کے سلسلے میں مثبت سوچ پیدا ہو سکے۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے ترکیبی عناصر میں مقاصد تعلیم، نصاب تعلیم، طریقہ تدریس، جائزہ، معلم اور متعلم کے تعلقات اور مسجد کے کردار کو مرتب کر کے اسلامی فکر و عمل کیلئے معیار بنایا گیا۔ علم اور تعلیم کے باب میں اسلام کی تعلیمات، نبی اکرم ﷺ کے اُسوہ حسنہ اور آپؐ کی قائم کردہ روایات کی روشنی میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کے مطالعہ سے تعلیم کی دنیا میں اسلام کا جو مخصوص کارنامہ ہمیں نظر آیا وہ علم اشیاء کی تعلیم سے انسان کے دُنیوی سفر کا آغاز ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اولین ضرورت علم ہے اور انسان کو انسان بنانے والی چیز تعلیم ہے۔ علم کو مسلمان کرنے کے لئے اسلام نے تعلیمی مقاصد کا واضح طور پر تعین کیا۔ اسلام کے نزدیک تعلیم کا پہلا اور بنیادی مقصد، ایسے افراد پیدا کرنا ہے۔ جو اسلامی نظریہ حیات کو سمجھتے ہوں، اس نظریہ پر

پختہ یقین رکھتے ہوں اور اپنی زندگی کو اس عالمگیر اور ابدی نظریہ کے مطابق ڈھال سکیں۔ اسلام علم برائے علم کا قائل نہیں۔ وہ تعلیم کو منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اسلام نے ایسا نصابِ تعلیم دیا جو تعلیم کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دے اور مسلمان کو اس قابل بنا دے کہ وہ خود شناسی اور کائنات شناسی کے اوصاف سے متصف ہو۔ نصاب کی تکمیل کے لئے اسلام نے، حکمت، نصیحت اور بحث کے تدریسی طریقوں کو کامیاب اور مفید قرار دیا۔ تعلیمی جائزہ اسلامی نظامِ تعلیم کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے۔ کیونکہ اس دارالعمل میں جسے ہم دنیا کہتے ہیں انسان جس قدر کوشش کرتا ہے اتنا ہی اسے صلہ ملتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر قدم پر اپنا احتساب کرتا اور یہ جائزہ لیتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ اگر اسے کوئی کوتاہی یا خامی نظر آئے تو اسے دُور کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسلامی نظامِ تعلیم میں استاد اور شاگرد بھی ہمہ وقت اپنی کاوشوں کو جانچتے رہتے تھے۔ اسلام نے جائزے کا ایسا مکمل نظام دیا جو شاگرد کو سخت محنت کرنے کی طرف راغب کرتا تھا۔ شاگرد کی تعلیم تحصیل سے متعلق نتائج کو فوری طور پر سامنے لاتا تھا اور شاگرد کو استاد کی دیانت دارانہ رائے اور ماہرانہ جائزے پر مکمل اعتماد تھا۔ استاد اور متعلم کے تعلقات کو اہمیت دیتے ہوئے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ ابھی تک ابلاغ عامہ کا کوئی ذریعہ معلم کا بدل نہیں ہو سکا۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ پورے نظام کا محور استاد تھا اور تعلیم کا پورا مزاج استاد کا بنایا ہوا تھا۔ استاد اور طالب علم میں گہرا قلبی ربط پایا جاتا تھا۔ استاد صرف معلم ہی نہیں مربّی بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح اسلام نے تعلیم اور مسجد کے باہمی تعلق کو خاص اہمیت دی۔ تعلیم کا دینی مزاج اس بات کا متقاضی تھا کہ دینی زندگی کے محور کو مسجد سے مربوط کیا جائے مسجد نبوی میں پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کر دیا اور بعد میں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس روایت کو فروغ

دیا گیا اور اس کے ذریعے طلبہ کی زندگیاں ہمارے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں پہلی چار صدیوں میں باقاعدہ مدارس کا نظام موجود نہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسجد اسلامی معاشرے کا مستقل اور مرکزی ادارے کے طور پر صرف ایک عبادت خانہ نہیں بلکہ دربار، عدالت، مقام مشاورت، مکتب، اقامت گاہ، کتب خانہ، مطب، فنون لطیفہ کی نمائش گاہ اور اعلانات کے مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ اخلاق ساز ادارہ دینی اور دُنیوی تعلیم و تربیت کیلئے مخصوص رہا ہے اور تعلیمی اعتبار سے آج بھی اتنا ہی زیادہ مؤثر اور مفید ہے جتنا چودہ صدیاں پیشتر تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں برطانوی نظام کے معیّنات، تعلیمی مقاصد، انگریزی زبان کی ترویج، مغربی ثقافت کا نفوذ، جدید علوم وفنون کی ترسیل اور عیسائیت کے پرچار کے سلسلے میں انگریزوں کی مساعی کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ انگریز تعلیمی نظام کو اس طرح استوار کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کی اخلاقی و ذہنی نشوونما کے ذریعے یہ جذبات پیدا کئے جائیں کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہوں اور تعلیم ہی کے ذریعے ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت حاصل کر سکیں۔ انگریزوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد لارڈ میکالے کے الفاظ ہی کافی ہیں کہ ''ہمیں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرز فکر، اخلاق، فہم وفراست کے نقطہ نظر سے انگریز ہو۔'' حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کو اس ملک کی تعلیم سے کوئی حقیقی دل چسپی نہ تھی۔ انہوں نے یہاں کے صحت مند اور ترقی پذیر تعلیم کو ختم کیا اور نیا نظام قائم کیا۔ جس میں نہ ملک کی ضروریات کا خیال رکھا گیا اور نہ ہی اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے تحت اسے پروان چڑھایا گیا اور صرف یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ صرف مغربی فنون، مغربی سائنس اور

مغربی فلسفہ وادب کی ترویج کی جائے ۔ نیز انگریزوں نے اپنا ثقافتی ورثہ برصغیر کے رہنے والوں میں بذریعہ تعلیم منتقل کرنے کی کوشش کی ۔ جس نے یہاں کے رہنے والوں کی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کردی اور مغربی ثقافت کو مشنری درس گاہوں میں انگریزی تاریخ ، انگریزی معاشرت ، انگریزی اخلاق کا بڑا دلفریب نقشہ طالب علموں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔

غرضیکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تعلیم پھیلنے سے بیداری ، آزاد خیالی اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوگئی ۔ مغربی علوم کی ترویج واشاعت سر سیّد احمد خان کی مساعی سے مسلمانوں میں مقبول ہوئی ۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نمونے پر ملک کے دوسرے حصوں میں کالج کھلنے لگے ۔ مشرقی ہندوستان میں (بنگال ، بہار وغیرہ) اشاعت تعلیم کا کام جسٹس امیر علی نے انجام دیا ۔ انہوں نے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن 1877ء میں کلکتہ میں قائم کی ۔ اس انجمن کا مقصد برطانوی تاج کی پوری وفاداری کرنا ، مغربی تہذیب اور جدید رجحانات کی ہمت افزائی کرنا ، بنگال میں اسکول و کالج قائم کرکے مغربی تعلیم کو فروغ دینا تھا ۔ انیسویں صدی سے قبل یورپین افراد نے جو سرگرمیاں اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان میں خود اپنی قوم یا دوسرے مقامی باشندوں کے لئے کیں ۔ بلاشبہ یہ سرگرمیاں مذہبی (عیسائی) عقائد کے نشر و اشاعت کے لئے تھیں ۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیرونی تاجروں کے زیر اثر تعلیم کی اشاعت و ترویج کا اصل مقصد اور منشاء ہندوستانی باشندوں میں مذہبی تبلیغ تھا ۔ یعنی مسیحیت کا پرچار ۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے مذہبی تعلیم کی ابتداء کی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہاں کے باشندوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینی شروع کی ۔ ساتھ ہی ان یورپین نو وارِدوں نے خود بھی مقامی

زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مقامی زبانوں کا سہارا لے کر ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم سے واقف کرانا تھا تاکہ حصول تعلیم کے بعد ہندوستانی، مسیحی مذہب کی تعلیم کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں زیادہ سرگرمی پادریوں اور مشنریوں نے دکھائی ہے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے انگریزوں کا دور سب سے زیادہ تلخ، سب سے زیادہ تباہ کن اور سب سے زیادہ مضرت رساں تھا۔ اس لئے نئی تعلیم میں اصل ہدف مسلمان ہی تھا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ انگریز اپنی چال میں کامیاب رہا اور اس نے محض تعلیم ہی کو تباہ نہ کیا بلکہ نئی نسل کے ذہن وفکر کو بھی بگاڑ دیا۔ برصغیر میں انگریزی نظامِ تعلیم کے مقابلے میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے دینی کردار اور تہذیبی کردار کا تاریخی جائزہ چار اَدوار، غزنوی، سلاطین دہلی، مغلیہ اور برطانوی میں پیش کیا گیا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں مسجد نبوی 'صفہ' اسلام کا پہلا مدرسہ تھا۔ صحابہ کرام پہلے طالب علم تھے اور رسول اکرمؐ پہلے معلم تھے۔ پہلی چار صدیوں تک باقاعدہ مدارس کا نظام موجود نہ تھا۔ مساجد ہی تعلیم کا مرکز تھیں۔ دوسرے دَور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ بڑے پیمانے پر مدارس قائم ہوئے۔ سب سے پہلے مدرسہ محمود غزنوی نے 410ھ میں غزنی میں قائم کیا۔ سلاطین دہلی کا دَور قطب الدین ایبک سے شروع ہو کر ابراہیم لودھی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دَور کئی اعتبار سے معروف ہے۔ اوّل ہندوستان میں ایک مسلم سلطنت کا قیام دوم، اسلام کی تبلیغ وتوسیع، سوم، علوم وفنون کی ترقی اور چہارم، فن تعمیر کے نادر تجربے اور بے شمار مساجد اور مقابر اس دَور کی زندہ یادگار ہیں۔ مسلمان اپنے مذہبی ذوق اور الٰہیاتی جذبہ کی بناء پر ہمیشہ تعلیم وتعلّم

اور درس وتدریس کو مذہبی مشغلہ اور کارِ خیر خیال کرتے رہے ہیں وہ طلباء کی امداد، تعلیم کی اشاعت، کتب وسامان، درس وتعلیم کا وقف، مدارس کی بنا وتاسیس اور علماء کی خدمت ومعاونت وغیرہ کو ایک مذہبی حکم اور برکت وفلاح دارین کا باعث سمجھتے رہے اور یہ چیز ان کے لئے زندگی کی طرح لازمی اور ضروری جزو تھی۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ہر فرد تعلیم کا زبردست علمبردار رہا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا دربار اپنے شباب کے زمانہ میں علماء اور کاملین کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ اپنی روشن خیالی کی وجہ سے تمام کُرّہ مشرقی میں مشہور رہا ہے۔

1857ء میں سلطنت مغلیہ کا جب چراغ گل ہو گیا تو انگریزوں کی سلطنت ہندوستان میں پشاور سے راس کماری تک اور بلوچستان سے برما تک پھیل گئی۔ اتنی وسیع سلطنت کے مالک برصغیر میں ایسی تعلیم چاہتے تھے جو ان کے ہر حال میں وفادار ہوں اور ہندیوں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنا دے۔ ہندوؤں کی اکثریت کے لئے ایسی جدید تعلیم کا حصول قابل قبول تھا۔ لیکن مسلمانوں کا ایک گروہ تعلیم کے ذریعے اسلامی تربیت کا کام سرانجام دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس دَور میں جو ادارے قائم کئے گئے انہوں نے اپنی اس ضرورت کا پورا پورا خیال رکھا۔ ان اداروں نے مسلمانوں کی علمی، تہذیبی اور سیاسی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ 1857ء کے بعد جدید دورِ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس دَور میں شمالی ہند میں مدارس نے دینی و دُنیوی ہر دو طرح کے علوم وفنون کو اپنے نصاب میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں جدید دَور کے جن تعلیمی اداروں نے دینی اور تہذیبی کردار کے حوالے سے خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان میں مدرسہ عالیہ کلکتہ،

فورٹ ولیم کالج، دارالعلوم دیوبند، دہلی کالج دہلی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اسلامیہ کالج پشاور، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے تعلیم، مذہب اور تہذیب کے حوالے سے ہندوستان کی جو خدمت کی ہے۔ وہ انگریزی نظامِ تعلیم کے مقابلے میں ایک لحاظ سے مزاحمت کا درجہ رکھتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اس مزاحمتی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ جس نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا اور اسلامی علوم اور روایات کو طوفان کے تھپیڑوں میں بھی روشن رکھا۔ دیوبند کے نظام نے اپنی حد تک اُمت کے مزاج کو بگڑ جانے سے بچایا ہے اور انگریز حکمرانوں اور بیرونی تہذیب کے مقابلے میں مزاحمت، مصالحت کے بجائے مقاومت اور ٹکراؤ کا علم بلند کیا ہے۔ دیوبند کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بناء پر وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہیگا۔ دوسری طرف سرسیّد احمد خان کی تحریک علی گڑھ، بظاہر مفاہمت کی تحریک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ایک حقیقی مؤرخ کی حیثیت سے اس تحریک کا سب سے اہم پہلو مزاحمتی نوعیت کا ہے۔ سرسیّد احمد خان کو انگریز سے نہ تو محبت تھی اور نہ ہی وہ انگریزی کلچر کے دلدادہ تھے وہ اگر فرنگی کی زبان اور ثقافت کی حمایت کرتے تھے۔ تو اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کے تمدّن سے براہ راست واقف ہو کر اور اس کی کمزوریوں سے آگاہ ہو کر ہی ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرسیّد احمد خان تعلیمی میدان میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ مسلمانوں میں ایک نئی امید اور نیا جوش پیدا ہوا اور ان میں اپنے مسائل خود حل کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے انہیں ایک قوم بنا دیا۔ انگریزوں کے نظامِ تعلیم کی مزاحمت میں بہتر رجحان کے ندوۃ العلماء کے علماء کرام نے یہ محسوس کیا

کہ جدید وقدیم میں افراط وتفریط سے مسلم قوم کے علمی وتعلیمی، معاشی ومعاشرتی مسائل حل نہیں ہوسکتے ۔ ندوۃ العلماء نے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان راستہ بنایا اور علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو صحیح انداز میں پیش کیا۔قرآن پاک، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، شریعت اور تصوف کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت انگریزی اور ہندی کو بھی شامل نصاب کرکے قدیم وجدید کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی جوان مہیب تاریکیوں کا سینہ تو نہ چیر سکی ۔لیکن اسی نے ان کے خلاف احتجاج کو ضرور وجود بخشا۔اسی طرح مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے قدیم وجدید علوم کی ترکیب صحیح توازن کے ساتھ پیش کرکے مسلمانوں کی جو تعلیمی، علمی، عملی اصلاح علم وعقیدہ کی تمام گمراہیوں سے پاک کرنے اور صحیح شاہراہ پر گامزن کرنے کے لئے صلاح وفلاح کا مدار قائم کیا وہ انگریزی نظامِ تعلیم کی مزاحمت میں ابدی وجاودانی کارناموں کو آنے والا مؤرخ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔

اِن مزاحمتی رجحان کے حامل اداروں کے علاوہ دیگر دینی وتعلیمی اداروں، مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور، دارالعلوم تقویۃ الاسلام امرتسر، مدرسہ مظہر العلوم کراچی، مدرسہ دارلرشاد پیر جھنڈا، مدرسہ امینیہ دہلی، علوم شرقی کے اداروں، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، انجمن پنجاب لاہور اور اُردو ذریعہ تعلیم کے اداروں، دہلی کالج، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، مدرسہ طبابت حیدرآباد، اور تعلیمی اور ادبی انجمنوں، انجمن حمایت اسلام، انجمن الاصلاح کلکتہ، انجمن اسلامیہ صفۃ الاسلام حیدرآباد دکن، انجمن اسلامیہ آگرہ کراچی، انجمن کشمیری مسلمانان لاہور، انجمن اصلاح وترقی سادات رضویہ امروہی، انجمن مسلم خواتین امراوتی، نے مزاحمتی کردار اپنے اپنے طور پر ادا کیا، اس مقالے میں ان کا بخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔

اس جائزے کا مقصد پاکستان میں سرکاری یا نجی سطح پر تعلیمی نظام میں اصلاح کی کوشش کے لئے روشنی اور ہدایت کا اہتمام کرنا تھا۔ دوسرا مقصد دینی مدارس اور عام سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیوٹ مدارس کے درمیان بُعد کم یا ختم کرنا اور دینی مدارس کو سرکار کی زیر سرپرستی تعلیمی نظام کی بنیاد پر استوار کرنا تا کہ دینی مدارس کے طلبہ وطالبات بھی دوسرے اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ وطالبات کی طرح عملی زندگی میں با قاعدہ شرکت کرسکیں اور دہرے نظام کا تاثر معاشرے سے ختم ہو جائے۔

سفارشات

سفارش کی جاتی ہے کہ

۱- مستقبل کے محققین

(الف) ان مسلم مفکرین کے نظریات سے بھی استفادہ کریں۔ جن کی تصانیف عربی اور فارسی زبان میں ہیں۔

(ب) عہد نبوی سے عہد عباسی تک تعلیمی نظام کا مطالعہ بھی صراحت سے کریں۔

(ج) برصغیر پاک وہند کے ان علاقوں، شہروں اور ریاستوں کے مزاحمتی تعلیمی دینی اداروں کا جائزہ بھی لیں جو تاریخ کے معروف اور مرکزی دھارے (Main stream) سے باہر ہیں۔

2- اسلام میں حصول علم کی فرضیت کے پیش نظر، ابتدائی تعلیم پاکستان میں جبری طور پر (قانوناً)

لازمی کردی جائے تا کہ ملک سے جہالت دُور ہو اور لوگ ایک جمہوری مملکت کے صحیح معنی میں شہری کہلا سکیں۔

3- پاکستان میں ایک نظامِ تعلیم کر دیا جائے پبلک اور مشنری سکولوں کو توقومیایا جائے۔ ان کے نظامِ تعلیم، نظامِ امتحان اور نصابات کو پاکستانی ڈسپلن کے تحت لایا جائے تا کہ طبقاتی تفریق ختم ہو۔ ایک نظامِ تعلیم کو اسلامی رنگ میں ڈھالنا آسان ہو گا۔

4- طالبات کے لئے بہت بڑی تعداد میں ہر سطح اور ہر درجے پر الگ تعلیمی و پیشہ ورانہ ادارے قائم کئے جائیں اور اس تاثر کو ختم کیا جائے کہ اسلام طالبات کی تعلیم کو طلبہ کی تعلیم کے مقابلے میں غیر اہم یا کم اہم سمجھتا ہے۔

5- دینی مدارس کے نصاب میں مفید دنیاوی، فنی و پیشہ ورانہ مضامین شامل کئے جائیں تا کہ فارغ التحصیل طلبہ اپنے لئے باوقار معاشی کفالت کا اہتمام کر سکیں۔

6- مروجہ نظامِ تعلیم کو بتدریج اسلامی قالب میں اس طرح ڈھالا جائے کہ مستقبل میں دینی مدارس کے علیحدہ متوازی وجود کی ضرورت ہی نہ رہے۔

7- دینی مدارس کے نظام کو عام نظامِ تعلیم سے مربوط کرنے کیلئے ایک مشترکہ بورڈ بنایا جائے۔ جس میں غیر جانبدار علماء اور جدید علوم کے ماہرین شامل ہوں۔

8- ایک الگ مثالی درس گاہ قائم کی جائے یا کسی ایک دینی مدرسے کو منتخب کر کے طلبہ کو ایسا نصاب پڑھایا جائے۔ جس میں موزوں تناسب کے ساتھ دینی مضامین اور عام مضامین شامل

ہوں۔ اس ادارے کے طلبہ عام امتحانی اداروں کے تحت امتحان دیں۔ جب یہ تجربہ کامیاب ہوجائے تو اس مشترکہ نصاب کو تمام دینی مدارس میں رائج کیا جائے۔ تاکہ نظاموں کی یہ دورنگی بتدریج ختم ہو۔

9- تعلیم کو حقیقی اہمیت دیکر بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جائے تاکہ تعلیمی معیار بہتر ہو سکے۔

10- تحقیق کے وسیلے سے قدیم مزاحمتی دینی تعلیمی اداروں کو زمانہ حال کے تناظر میں پرکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آیا مزاحمت کے تناظر میں اداروں کی تاحال ضرورت اور اہمیت ہے یا نہیں۔

کتابیات

1- ابوالحسنات ندوی، مولانا (1992ء)، ہندوستان کی قدیم درسگاہیں، امرتسر، روز بازار، الیکٹرک پریس، ہال بازار

2- ابوالفضل (1975ء)، آئین اکبری، مترجم بلاحمان، جلد اوّل، لاہور، طبع عکس

3- ابوسلمان شاہ جہاں پوری (74-1973ء)، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

4- ____ (74-1973ء)، ''یونیورسٹی اورینٹیل کالج لاہور''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

5- ____ (74-1973ء)، ''انجمن ہدایت اسلام دہلی''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

6- احمد، ڈاکٹر (لسٹر) (1977ء)، ''اسلام کا نظریہ تعلیم''، محور، مجلّہ، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، سٹوڈنٹس یونین

7- احمد شلبی، ڈاکٹر (1963ء)، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ، مترجم محمد حسین خان زبیری، لاہور، کلب روڈ، ادارہ ثقافت اسلامیہ

8- اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر (1975ء)، ایجوکیشن ان پاکستان، کراچی، معارف لمیٹڈ

9- افتخار احمد غوری، ڈاکٹر (1989ء)، ''سلطان دہلی کے دَور کی انتظامی اور سیاسی تاریخ''، تاریخ برصغیر، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

-10 اقبال احمد خان (75-1974ء)، ''اسلامیہ کالج پشاور'' برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-11 اکرام قریشی، ایس ایم شاہد (1988ء)، علم التعلیم، لاہور، مجید بک ڈپو

-12 الطاف حسین حالی (1966ء)، حیات جاوید، لاہور، مطبوعہ آئینہ ادب

-13 امام الدین، مرتب (1874ء)، سیّد احمد خان کے لیکچرز و اسپیچز، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس

-14 امام غزالی (سن ندارد)، احیائے علوم الدین، مترجم محمد احسن صدیقی، اُردو ترجمہ بعنوان مذاق العارفین، لاہور، شیخ غلام حسین اینڈ سنز، اُردو بازار

-15 امیر الاسلام، پروفیسر (1975-1974ء)، ''مدرسہ عالیہ نظامیہ لکھنؤ''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-16 ______ (75-1974ء)، ''مدرسہ عالیہ کلکتہ''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-17 ______ (75-1974ء)، ''فورٹ ولیم کالج کلکتہ''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-18 امیر الہدیٰ (1973ء)، مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی کارنامے، حصہ اوّل، کراچی، قمر کتاب گھر

-19 انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز (1986ء)، تعلیم - اسلامی تناظر میں، نمبر 4، اسلام آباد

-20 ______ (1987ء)، تعلیم - اسلامی تناظر میں، نمبر 5، اسلام آباد

-21 اے آر مُلِک (1954ء)، برٹش پالیسی اینڈ دی مسلم بنگال، ڈھاکہ، کواپریٹو پبلی کیشنز

-22 ایس ایم جعفر (1987ء)، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، لاہور، مکتبہ عالیہ

-23 ______ (1988ء)، مغل ایمپائر، لاہور، مکتبہ عالیہ

-24 ______ (1986ء)، سم کلچرل اسپیکٹس آف مسلم رول ان انڈیا، لاہو، مکتبہ عالیہ

-25 ایس ایم شاہد (1984ء)، سرسیّد، حالی، اکبر کے تعلیم پر مقالے، لاہور، گلوپ پبلیشرز اُردو بازار

-26 ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن (سن ندارد)، تاریخ ہند، جلد دوم، مترجم پروفیسر محمد حبیب، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

-27 ایم اے عزیز (1983ء)، تعلیم اور معاشری تبدیلی، ملتان، کاروان ادب

-28 این۔این۔لاء، ڈاکڑ (1972ء)، پاک وہند میں تعلیمی ترقی، کراچی، اکیڈیمی آف ایجوکیشن ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس

-29 ______ (1974ء)، عہد اسلامی میں علمی ترقی، کراچی، اکیڈیمی آف ایجوکیشن ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس

-30 ______ (1916ء)، پروموشن آف لرننگ ان انڈیا، لندن، آکسفوڈر پریس

-31 بختیار حسین صدیقی، پروفیسر (1983ء)، مسلمانوں کی تعلیمی فکر کا ارتقاء، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

-32 تاراچند (1964ء)، تمدّن ہند پر اسلامی اثرات، لاہور، مجلس ترقی ادب

-33 تنویر احمد علوی، ڈاکڑ (سن ندارد)، سخن مختصر سرسیّد کے سیاسی افکار، دہلی، شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی

-34 جمیل جالبی، ڈاکڑ (1985ء)، پاکستانی کلچر، طبع سوم، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن

-35 جمیل یوسف (1989ء)، بابر سے ظفر تک، اسلام آباد، کتاب گھر 2022 آئی، 2/10

-36 جواہر لال نہرو پنڈت (1962ء)، خودنوشت سوانح حیات، دہلی، نیو دہلی الائیڈ پبلیشرز

-37 جیلانی کامران (1985ء)، انگریزی زبان اور ادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان

-38 حسین احمد مدنی، مولانا (1988ء)، تحریک ریشمی رومال، لاہور، کلاسیک، 42 دی مال

-39 حمید احمد خانؒ، پروفیسر (1975ء)، تعلیم وتہذیب، لاہور، مجلس ترقی ادب

-41 حیدر سندھی، ڈاکٹر (1985ء) ''بولیں جا سرچشمہ کنداور سندھ'' سندھ، التہاس پبلیکشنز

-42 خالد یار خان (1963ء)، تاریخ التعلیم، لاہور، اُردو مرکز

-43 خرم جاہ مراد (1981ء)، احیائے علوم اسلامیہ اور تعلیم، لاہور، تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان

-44 خورشید احمد، پروفیسر (1977ء)، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم''، محور، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، سٹوڈینٹس

-45 ______ (1982ء)، اسلامی نظریہ حیات، کراچی، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ

-46 خورشید احمد صدیقی، پروفیسر (2000ء)، ''سرسیّد اور علی گڑھ''، مسلک، ملتان، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن

-47 ذاکر حسین (1943ء)، تعلیمی خطبات، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

-48 رشید امجد، پروفیسر، سیّد فاروق علی، پروفیسر، مرتبین (1980ء)، سرسیّدین۔ تعلیم نمبر، راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج

-49 سرسیّد احمد خان (1859ء)، اسباب بغاوت ہند، دہلی، یونیورسٹی پبلیشرز وکتب خانہ، انجمن ترقی اُردو

50- ـــــــــــ (1287ھ)، رسالہ تہذیب الاخلاق جلد اوّل، علی گڑھ، طبع علی گڑھ

51- سعید اختر، پروفیسر (1991ء)، ہمارا نظام تعلیم، لاہور، ادارہ تعلیم و تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان

52- سورج بھان، مہتمم (1865ء)، انجمن پنجاب، لاہور، رسالہ، شمارہ، مطبع کوہِ نور پریس

53- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (1963ء)، تعلیمات، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹیڈ، شاہ عالم مارکیٹ

54- سیّد ابوالحسن علی ندوی، مولانا (1961ء)، ہندوستانی مسلمان، لکھنؤ، تنویر پریس

55- سیّد ابوبکر غزنوی (1974ء)، حضرت، مولانا داؤد غزنوی، لاہور، مکتبہ غزنویہ، 4 شیش محل روڈ

56- سیّد اصغر علی شاہ جعفری (1983ء)، تحریک پاکستان اور اس کا پس منظر، لاہور، نیوبک پلیس، اُردو بازار

57- سیّد افتخار عالم (1975-1974)، ''تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

58- سیّد حامد علی (75-1974ء)، ''انجمن اسلام بمبئی اور دیگر ادارے''، برصغیر پاک و ہند کے علمی اور ادبی ادارے، مجلّہ علم آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

59- سیّد حسین احمد مدنی (1998ء)، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا، لاہور، مکی دارالکتب، اُردو بازار

60- سیّد سلیمان ندوی، علامہ (1940ء)، ہندوستان کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں، اعظم گڑھ، مطبوعہ دارالمصنفین

61- ـــــــــــ (سن ندارد)، حیات شبلی، اعظم گڑھ، مطبوعہ دارالمصنفین

62- سیّد شبیر بخاری (1986ء)، میکالے اور برصغیر کا نظام، لاہور، تعلیم مخدوم جہانیاں اکادمی، علامہ اقبال ٹاؤن

63- سیّد طفیل احمد منگلوری علیگ (1971ء)، مسلمانوں کا روشن مستقبل، لاہور، حماد الکتبی، شیش محل روڈ

64- سیّد عبدالقادر، محمد شجاع الدین (1956ء)، تاریخ پاک و ہند، لاہور، حق برادران، اُردو بازار

65- سیّد عبداللہ، ڈاکٹر (1989ء)، سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کا اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان

66- ______ (1977ء)، کلچر کا مسئلہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز

67- سیّد محمد محبوب رضوی (1954ء)، تاریخ دار العلوم دیوبند، کراچی، میر محمد کتب خانہ، مرکز وادب آرام باغ

68- سیّد محمد الحسنی (1964ء)، سیرت، مولانا سیّد محمد علی مونگیری، لکھنو، مطبوعہ شاہی پریس

69- سیّد محمد سلیم، پروفیسر (1980ء)، ہند و پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز

70- ______ (1985)، مغربی نظامِ تعلیم، لاہور، تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان

71- ______ (1989ء)، مسلمان اور مغربی تعلیم، لاہور، تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان

72- سیّد محمد میاں (1947ء)، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، اعظم گڑھ، دار المصنفین

73- سیّد محمود احمد برکاتی (75-1974ء)، ''مدرسہ طبابت حیدر آباد''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-74 سیّد مصطفیٰ علی بریلوی (1971ء)، مسلمانانِ بنگال کی تعلیم، کراچی، اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

-75 سیّد مناظر احسن گیلانی، مولانا (سن ندارد)، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار

-76 _____ (سن ندارد)، سوانح قاسمی جلد دوم، طبع دیوبند

-77 سیّد منظور حسین شاہ (75-1974ء)، ''متفرق تعلیمی و تبلیغی اصلاحی ادارے''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی، اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-78 سیّد نوراللہ (1981ء)، تاریخ تعلیم ہند، کراچی، ساوتھ ایشین پبلیشرز

-79 سیّد ہاشمی فرید آبادی (1990ء)، مغلوں کے زوال سے قیام پاکستان تک، لاہور، ادارۂ معارف اسلامی

-80 شاہد حسین رزاقی (1963ء)، سرسیّد اور اصلاحی معاشرہ، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

-81 شاہ معین الدین احمد ندوی (1948ء)، تاریخ اسلام، لاہور، ادارہ نشریات اسلام

-82 شبلی نعمانی، مولانا (1961ء)، الغزالی، لاہور، ایم ثناء اللہ پبلیشرز

-83 _____ (1955ء)، مقالات شبلی جلد دوم، اعظم گڑھ، دارالمصیفین، معارف

-84 _____ (1958ء)، مقالات شبلی جلد چہارم، اعظم گڑھ، دارالمصیفین، معارف

-85 _____ (1992ء)، شعرالعجم جلد اوّل، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن

-86 شبیر احمد (1974ء)، تعلیم کی کہانی، کراچی، کفایت اکیڈیمی

-87 شفقت رضوی (75-1974ء)، ''دہلی کالج دہلی''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-88 شمائل احمد شمیم (74-1973ء)، ''آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-89 شمیم حیدر ترمذی، ڈاکٹر (1993ء)، اسلام کا نظام تعلیم، لاہور، کاروان ادب، اُردو بازار

-90 صدر الدین اصلاحی، مولانا (1990ء)، اسلام ایک نظر میں، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ

-91 صدیق الرحمان قدوائی (1961ء)، ماسٹر رام چندر، بمبئی، ادبی پرنٹنگ پریس

-92 صفدر حیات صفدر اور غلام جیلانی مخدوم (1989ء)، اسلامی عہد کے مسلمان حکمرانوں کے تہذیبی اور سیاسی کارنامے، لاہور، نیوبک پیلس، اُردو بازار

-93 صفدر حیات صفدر (سن ندارد)، اسلامی ہند کے مسلم حکمرانوں کے تہذیبی اور سیاسی کارنامے''، لاہور، نیوبک پیلس، اُردو بازار

-94 ______ (سن ندارد)، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدّنی کارنامے، لاہور، نیوبک پیلس، اُردو بازار

-95 صفیہ بانو، ڈاکٹر (1978ء)، انجمن پنجاب، کراچی، کفایت اکیڈیمی، اُردو بازار

-96 ضیاء الدین برنی (1985ء)، تاریخ فیروز شاہی، مترجم سیّد معین الحق، لاہور، اُردو سائنس بورڈ

-97 طارق محمود راجہ (1985ء)، سر سیّد احمد خان، جہلم، بک کارنر، چوک فیصل شہید، مین بازار، پاکستان

-98 ظفر حسین خان (1975ء)، تاریخ التعلیم، کراچی، مکتبہ فریدی

-99 ______ (1980ء)، پاکستان کا تعلیمی تناظر، حصہ دوم، کراچی، مکتبہ فریدی

-100 عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر (1960ء)، چند ہم عصر، کراچی، انجمن ترقی اُردو

-101 ______ (1959ء)، سر سیّد احمد خان حالات و افکار، کراچی، انجمن ترقی اُردو

-102 عبدالحی، مولوی (مترجم) (1864ء)، طبقات ناصری، کلکتہ، بنگال ایشاٹک سوسائٹی

-103 عبدالرحمان اصلاحی (1975-1974ء)، ''مدرسۃ الاصلاح سرائے میر''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی ادارے تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

-104 عبدالرحمٰن بن خلدون (1986ء)، مقدمہ ابن خلدون، مترجم، مولانا راغب رحمانی، کراچی، نفیس اکیڈمی، تیرتھ داس روڈ، اُردو بازار

-105 عبدالرزاق سکندر الازہری (1979ء)، عزم نو، اسلامی تعلیم نمبر، لاہور، اسلامی نظامِ تعلیم، جمعیت علمائے اسلام

-106 عبدالرشید ارشد (1985ء)، ہمارا نظامِ تعلیم، ملتان، کاروانِ ادب

-107 عبدالسلام چوہدری (1996ء)، رہبر علم التعلیم، لاہور، قریشی برادرز پبلیشرز، چوک اُردو بازار

-108 عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر (1996ء)، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور، مجلس ترقی اُردو ادب

-109 عبدالقادر سروری (1934ء)، حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی، دکن، اعظم اسٹیم پریس

-110 عبدالمجید سالک (سن ندارد)، مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

-111 عبداللہ ملک (1978ء)، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدو جہد آزادی، لاہور، ترقی ادب

-112 عبداللہ یوسف علی (1994ء)، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ، لاہور، دوست ایسوسی ایشن، الکریم مارکیٹ اُردو بازار

113- عرشیہ شفقت رضوی (75-1974ء)،''جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

114- عشرت رحمانی (سن ندارد)، پاکستان سے پاکستان تک، لاہور، مقبول اکیڈمی انار کلی

115- عصمت اللہ خان، پروفیسر (75-1974ء)،''سائنٹیفک سوسائیٹی علی گڑھ''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادرے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

116- علی اوسط صدیقی (1983ء)، اسلامی نظامِ تعلیم، کراچی، طاہر سنز

117- علی محمد خان (1925ء)، قرات احمدی، جلد اوّل، بدایوں، مطبوعہ نظامی پریس

118- غلام جیلانی برق (1971ء)، ہماری عظیم تہذیب، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز

119- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر (1962ء)، تاریخ اورینٹیل کالج لاہور، لاہور، جدید اُردو پریس

120- _____ (1966ء)، اُردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، لاہور، پنجاب یونیورسٹی پریس

121- غلام رسول مہر (1970ء)، 1857 کے مجاہد، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، انار کلی

122- غلام رسول، پروفیسر (سن ندارد)، سلاطین دہلی، لاہور، نیو بک پیلس، اُردو بازار

123- غلام عابد خان (1986ء)، عہد نبوی کا نظامِ تعلیم، لاہور، مکتبہ میری لائبریری

124- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (2000ء)،''سر سیّد احمد خان اور راجہ موہن رائے''، مسلک، ملتان، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن

125- فوق کریمی، ڈاکٹر (1990ء)، سر سیّد کے سیاسی افکار، لاہور، ایشیا بک سینٹر

126- فیروز شاہ تغلق (1943ء)، تاریخ فیروز شاہی، مترجم صادق حسین صدیقی، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، نولکھا بازار

127- قاضی جاوید (1995ء)، ہندی مسلم تہذیب، ''تخلیقات''، لاہور، اکرم آرکیڈ، ٹمپل روڈ

128- _____ (1998ء)، سرسیّد سے اقبال تک، ''تخلیقات'' لاہور، ٹمپل روڈ

129- کمال الدین حیدر (1907ء)، قیصر التواریخ، لکھنؤ، نول کشور پریس

130- گلبدن بیگم (1966ء)، ہمایوں نامہ، مترجم رشید اختر ندوی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، اُردو بازار

131- گل محمد مہر (1988ء)، پاکستان میں پرائمری تعلیم، ملتان، بیکن بکس، گل گشت کالونی

132- لعل احمد، تبسم (75-1974ء)، ''جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

133- مبارک علی، ڈاکٹر (1986ء الف)، تاریخ وآگہی، لاہور، نگارشات، 4 بیگم روڈ

134- _____ (1986ء ب)، تاریخ اور روشنی، لاہور، نگارشات، 4 بیگم روڈ

135- محمد ادریس (1956ء)، ''جامع العلوم اسلامیہ''، ماہانہ بینات، کراچی، علامہ بنوری ٹاؤن، 5 شمارہ جون، جولائی

136- محمد اسحاق بھٹی (1974ء)، فقہائے ہند، حصہ دوم، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

137- محمد اسلام، ڈاکٹر (74-1973ء)، ''دارالعلوم ندوۃ العلماء''، برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی وتعلیمی ادارے، مجلّہ علم وآگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

138- محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا (1963ء)، مقالات سرسیّد حصہ دوازدہم، لاہور، مجلس ترقی ادب

139- _____ (1993ء)، مقالات سرسیّد احمد خان، جلد ہشتم، لاہور، مجلس ترقی ادب

140- محمد اقبال شیخ (1964ء)، داستان اسلام، حصہ چہارم، لاہور، علمی کتاب خانہ

141- محمد اکرام شیخ (1958ء)، رود کوثر، لاہور، فیروز سنز

142- ______ (1975ء)، موج کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

143- ______ (1964ء)، آب کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

144- محمد امین زبیری (1964ء)، تذکرہ سر سیّد، لاہور، یونائیٹڈ پبلیشرز

145- ______ (1934ء)، حیات محسن، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

146- محمد حسین آزاد (1937ء)، دربار اکبری، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز

147- محمد حنیف ندوی (1956ء)، افکار غزالی، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

148- محمد حیات خان (سن ندارد)، مختصر تاریخ انجمن حمایت اسلام، لاہور، انجمن حمایت اسلام

149- محمد رفیع الدین (1975ء)، اسلام کا نظریہ تعلیم، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

150- محمد رفیق شیخ (1991ء)، تاریخ پاکستان و ہند مسلم دور، لاہور، سٹینڈرڈ بک ہاؤس اُردو بازار

151- محمد ساقی مستعد خان (1945ء)، مآثر عالمگیری، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز

152- محمد سعید حکیم (1984ء)، نظریہ وفلسفہ تعلیم اسلامی، جلد اول، کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

153- ______ (1988ء)، نظریہ وفلسفہ تعلیم اسلامی، جلد دوم، کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

154- محمد شجاع الدین (سن ندارد)، مجلّہ نقوش لاہور، لاہور، سیاسی اور ثقافتی تاریخ، لاہور نمبر، ادارہ فروغ اُردو

155- محمد شفیع خان (1933ء)، مدرسۃ الاصلاح کی سرگزشت اور اس کا تخیل، اعظم گڑھ، مطبع معارف

156- محمد طاسین، مولانا (1979ء)، ''اسلامی نظام تعلیم کا مفہوم و مطلب''، عزم نو اسلامی تعلیم نمبر، لاہور، مرتبہ، منظور احمد جاوید، جمعیت طلباء اسلام، شاہ رکن عالم مارکیٹ

157- محمد طیب، مولانا (1957ء)، آزادی ہندوستان کا خاموش رہنما، کراچی، کریم سنز پبلشرز

158- ـــــــ (1969ء)، تاریخ دارالعلوم دیوبند، کراچی، میر محمد کتب خانہ

159- ـــــــ (سن ندارد)، دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، سہارن پور، طبع دیوبند

160- محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر (1976ء)، پاک و ہند میں اسلامی خطاطی، لاہور، کتاب خانہ نورس

161- محمد عبداللہ خویشگی (1952ء)، مقالات سرسیّد، علی گڑھ، نیشنل پرنٹرز کمپنی

162- محمد عبداللہ ملک (1980ء)، تاریخ پاک و ہند، لاہور، قریشی برادرز، اُردو بازار

163- محمد علی جوہر (1921ء)، نصاب تعلیم جامعہ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

164- محمد قاسم فرشتہ (1969ء)، تاریخ فرشتہ (جلد اول)، ترجمہ عبدالحی خواجہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ادبی مارکیٹ

165- ـــــــ (1969)، تاریخ فرشتہ (جلد دوم)، ترجمہ عبدالحی خواجہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ادبی مارکیٹ

166- محمد قاسم نانوتوی، مولانا (سن ندارد)، انتشار الاسلام، سہارن پور، طبع دیوبند

167- محمد منتظر الدین (75-1974ء)، ''مدرسہ امینہ دہلی''، برصغیر کے علمی، ادبی، اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، نیشنل کالج

168- مختار مسعود (1973ء)، آوازِ دوست، لاہور، مکتبہ جدید پریس

169- مسکین علی حجازی، ڈاکٹر (1997ء)، پنجاب میں اُردو صحافت کی تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

170- معین الدین عقیل، ڈاکٹر (75-1974ء)، ''مدرسہ مظہر العلوم کراچی''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و آگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

171- ____ (2000ء)، ''اقبال اور سر سیّد احمد خان''، مسلک، ملتان گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن

172- ممتاز احمد، پروفیسر (1997ء)، علم التعلیم، حصہ دوم، لاہور قریشی برادرز، اُردو بازار

173- منظور احمد جاوید (1979ء)، عزم نو- اسلامی تعلیم نمبر، لاہور جمعیت طلبائے اسلام، شاہ عالم

174- منور ابن صادق (1973ء)، تعلیم و تعلم، لاہور، صادقہ پبلی کیشنز

175- منور جہاں رشید (1985ء)، قدیم اسلامی مدارس، لاہور، مجلس ترقی ادب

176- نادم سیتاپوری (1971ء)، خلاصہ مقدمہ ابن خلدون، لاہور، فیروز سنز لمٹیڈ

177- نذیر چوہدری (75-1974ء)، ''مدرسۃ العلوم علی گڑھ''، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلّہ علم و اگہی، کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج

178- نظر کامرانی، ڈاکٹر (1998ء)، سر سیّد احمد خان ماہر تعلیم، مصلح قوم، مفکر اعظم، کراچی، ماہانہ تہذیب جلد 15

179- نورالدین جہانگیر بادشاہ (1987ء)، تزک جہانگیری، لاہور، مترجم مولوی احمد علی رام پوری، سنگ میل پبلی کیشنز

180- وفا راشدی، ڈاکٹر (1986ء)، مہران نقش، کراچی، مکتبہ اشاعت اُردو

181- نورالحسن خان (1956ء)، غزالی کا تصور اخلاق، لاہور، مکتبہ علمیہ

182- یوسف حسین خان، ڈاکٹر (1948ء)، تاریخ ہند (عہد جدید)، حیدر آباد دکن، مطبوعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

BIBLIOGRAPHY

183- Askari, Hamid, (1979), Society and State in Pakistan-An Introduction,Lahore,Progressive Books

184- Al-Attas, Muhammad AI-Naquib (1979), Aims and Objectives of Islamic Education, Jeddah, Hodder and Stoughton, King Abdul Aziz University

185- Baloch, N.B. (1986), Knowledge for What?, Islambad, National Hijra Council

186- _____ An Aritcle, january(1961), Traditional Cultures in west Pakistan, Hyderabad, Published in Journal of Education, Vol:111, Institute of Education

187- Boyer, Carlton, (1970), Philosophical Perspectives for Education, London, Scott Forsman and Co

188- Carter, V.Good, (1960), Dictionary of Education, New york, Mc Graw Hill, Inc: Macmillan Company

189- Harold Rugg and William Writer, (1967), Social foundation of Education, USA, Prentic-Hall, INC

190- Hornby, S. and others, (1963), The Advanced Learner's Dictionary of English, London, Oxford University Press

191- Khalid, Tanvir, (1983), Education, Islamabad, National Book Foundation

192- Khan, Sharif, (1987), Islamic Education, Lahore, Republican Books

19-3 Majumdar, R.C. (1956), An Advanced History of India, U.K., Macmillan and Co

194- Qureshi, Mansoor, (1983), Some Aspects of Muslim Education, Lahore, Universal Books

195- Rehmani, Begum, (1985), Sir Syed Ahmad Khan, Lahore, The Policies of Educational Reforms, vanguard

196- Robert, A. Hall (Jr), (1960), Linguistics and your Language, New York, Anchor Book, Double Day and Company, INC

197- Sajjad, Syed, (1979), Crisis in Muslim Education, Jeddah, Hadder and Stonghton, King Abdul Aziz University

198- Seaky, John, (1985), Religious Education: Philosophical Perspectives, London, George Allen and Unwin

199- Shaikh, Ashgar Ali, (1981), Perspectives in Education, Lahore, Aziz Publishers

200- Siddiqui, B.H., (1986), Education: An Islamic Perspective, Islamabd, National Academy of Higher Education

201- Wasiullah, Muhammad, (1981), Education and Society in Muslim World, Jeddah, Hodder and Stoughtan, King Abdul Aziz University

ضمیمہ الف

برصغیر پاک و ہند کے تعلیمی ادارے

نام شہر	نام ادارہ
لکھنؤ	مدرسہ عالیہ لکھنؤ
دہلی	مدرسہ رحیمیہ
دہلی	مدرسہ دارالبقاً
دہلی	مدرسہ نذیریہ
دہلی	مدرسہ امینیہ
دہلی	مدرسہ نظارۃ المعاوف القرآنیہ

رام پور	مدرسہ عالیہ
شہدادکوٹ	مدرسہ نور محمدیہ
امرتسر	دارالعلوم تقویۃ السلام
کوئٹہ	مدرسہ درخانی
کراچی	مدرسہ مظہر العلوم
پیر جھنڈا	دارالرشاد
اجمیر	مدرسہ معینیہ عثمانیہ
ٹونک	دارالعلوم خلیلیہ برکاتیہ
ٹھیڑی	مدرسہ دارالہدیٰ
کلکتہ	مدرسہ دارالرشاد
سرائے میر	مدرسہ دارالاصلاح
کلکتہ	مدرسہ اسلامیہ
کان پور	مدرسہ الٰہیات
سجاول	دارلفیوض الہاشمیہ
بدایوں	مدرسہ شمس العلوم
ہوگلی	ہوگلی کالج
وانمباڑی	دارالعلوم وانمباڑی

تاریخی و آثار قدیمہ کے ادارے

نام شہر	نام ادارہ
لاہور	ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان
روہیل کھنڈ	مجلس تاریخ روہیل کھنڈ
لاہور	تاریخی مجلس
دہلی	نیشنل آرکاٹیوز آف انڈیا
حیدرآباد	آرکیولوجیکل سوسائٹی
	چند یانچی ادارے
دہلی	آرکیالوجیکل سوسائٹی

چند اصلاحی و تبلیغی ادارے

نام شہر	نام ادارہ
رانچی	انجمن اسلامیہ
حیدرآباد	مسلم ایجوکیشن
پونا	جمعتیہ دعوۃ و تبلیغ، چند تعلیمی انجمنیں
کراچی	المرکز اسلامی، ادارہ طلوع اسلام
لاہور	تعلیم القرآن خط و کتابت،
	متفرق تعلیمی۔ اصلاحی و تبلیغی ادارے۔

علمی و ادبی ادارے

نام شہر	نام ادارہ
سندھ	سندھ مسلم ادبی سوسائٹی
لاہور	مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی
پاکستان	ادارہ مصنفین
کراچی	مجلس المعارف
بہاولپور	اُردو اکادمی
کوئٹہ	ادارہ ادب بلوچستان
کوئٹہ	حلقہ ادب اسلامی
کراچی	ایوان اُردو
مری	مری لٹریری سرکل
	مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
بلوچستان	بلوچستان کے ادبی ادارے
لاہور	لاہور کے چند ادبی ادارے
کراچی	کراچی کے چند ادبی ادارے
لاڑکانہ	لاڑکانہ کے چند ادبی ادارے

گوجرانوالہ	گوجرانوالہ کی ادبی انجمنیں
	پاکستان کے چند دیگر ادبی ادارے
دہلی	دہلی کے چند ادبی ادارے
جے پور	جے پور کے چند ادبی ادارے
حیدرآباد	حیدرآباد دکن کے چند ادبی ادارے
بنگال	بنگال کے ادبی ادارے
بھوپال	بھوپال کے علمی وادبی ادارے
	چند دیگر علمی وادبی ادارے
	چند قدیم ادارے
	متفرق علمی وادبی ادارے

علمی وفنی ادارے

نام شہر	نام ادارہ
پاکستان	سائنٹیفک سوسائٹی
کراچی	مجلس آداب کتاب
	برصغیر کے طبی ادارے
کراچی	ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن
	انجمن ترقی طب

ڈھاکہ	طبیہ، حبیبیہ کالج
	چند دیگر علمی وفنی ادارے
ڈھاکہ	پاکستان فلاسفیکل کانگرس

دینی علمی ادارے

لاہور	ادارہ معارف اسلامیہ
دہلی	بیت الحکمت
دہلی	ادارہ معارف اسلامیہ ہند
لکھنو	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
دیوبند	مجلس معارف القرآن
لاہور	انجمن خدام الدین
لاہور	انجمن خدام القرآن
کراچی	مجلس علمی
لاہور	مسلم اکادمی
کراچی	ادارہ معارف اسلامی

لاہور	ترویج اسلامی اکادمی
لاہور	علماءاکیڈیمی
لاہور	چلڈرن قرآن سوسائٹی
	ادارہ عالمگیر تحریک قرآن
	چند دیگر علمی ادارے
	جلسہ تائید دین متین

علاقائی ادبی لسانی ادارے

نام شہر	نام ادارہ
حیدرآباد	سندھی ادبی بورڈ
سندھ	جمعیت الشعراء
	سندھی زبان وادب کے چند دیگرادارے
لاہور	پنجابی ادبی اکیڈیمی
پشاور	پشتو اکیڈیمی
کوئٹہ	پشتو ادبی ٹولہ
	چند مزید ادبی لسانی ادارے

ثقافتی ادبی ادارے

راچی	پاکستان کلچرل سوسائٹی
سلام آباد	علاقائی ثقافتی ادارہ
	ثقافتی ادارے ادبی
	ثقافتی وفنی ادارے
	پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس
	لوک ورثہ کا عمومی ادارہ

شخصیاتی علمی ادارے

نام شہر	نام ادارہ
حیدرآباد	شاہ ولی اللہ اکیڈیمی
شہدادنگر	محمد قاسم ولی اللہ تھیولجیکل کالج
کراچی	برکات اکیڈیمی
لاہور	مرکزیہ مجلس اقبال
	اقبالیات کے دیگر ادارے
کراچی	اقبال اکادمی
دہلی	غالب اکیڈیمی
	غالب کے چند دیگر ادارے

کراچی	ادارہ یادگارِ غالب
کراچی	جناح ریسرچ اکیڈیمی
کراچی	بہادر یار جنگ اکادمی
کراچی	مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈیمی
	سندھ کے چند ادبی شخصیاتی ادارے
	متفرق ادبی شخصیاتی ادارے
کراچی	غضنفر اکیڈیمی

ضمیمہ ب

برصغیر کی انجمنیں

انجمن اسلامیہ گوجرانوالہ، اسلامی انجمن اجمیر، انجمن اسلامیہ ہوشیار پور، انجمن اسلامیہ کپورتھلہ، انجمن اسلامیہ جالندھر، انجمن اسلامیہ سیالکوٹ، انجمن اسلامیہ لاہور، انجمن اسلامیہ دہلی، انجمن اسلامیہ بمبئی، انجمن اسلامیہ لکھنؤ، (انجمن) مجلس اسلامی علی گڑھ، انجمن اسلامی بریلوی

علمی و ادبی انجمنیں

ادبی انجمن کلکتہ، انجمن مغل سرائے، ادبی مجلس دہلی، سائنٹیفک سوسائٹی بہار، انجمن آگرہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، رائل ایشیاٹک سوائٹی بمبئی، سوسائٹی کانپور، انجمن کانگڑہ،

جبل پور، انجمن اشاعت علوم جبل پور، انجمن رائے پور، انجمن فیصل آباد، انجمن پرتاب گڑھ، انجمن نینی تال، مرزاپور، سوسائٹی مرزاپور، انجمن عرب سرائے، انجمن پشاور، روہیل کھنڈ ادبی انجمن، بریلی۔ زمرہ احباب بنگلور، لکھنؤ سوسائٹی لکھنؤ، کلکتہ سوسائٹی کلکتہ، لاہور سوسائٹی لاہور، انجمن ادب پٹنہ، سائنٹیفک ایسوسی ایشن کلکتہ، انجمن ادب عامہ بمبئی، ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی خطب، مجلس مذاکرہ علمیہ اہل اسلام کلکتہ، انجمن لاہور، انجمن دہلی (دہلی سوسائٹی)، دہلی انسٹی ٹیوٹ، انجمن سیالکوٹ، سائنٹیفک سوسائٹی کلکتہ، مجلس علمی جموں وکشمیر، انجمن ادبی جے پور، الہ آباد انسٹی ٹیوٹ، الہٰ اباد، ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن علی گڑھ، انجمن شاہجہان پور، نینی تال انسٹی ٹیوٹ۔

علمی وفنی ادارے

انجمن جغرافیہ بمبئی، انجمن فلکیات میرٹھ، انجمن ہمالیہ وانجمن حیوانات لاہور، انجمن مطالعہ فلکیات، طبی انجمن جبل پور، انجمن علم عمرانی کلکتہ انجمن آثار قدیمہ آگرہ

مجالس مباحثہ

مجلس مباحثہ (ڈیبیٹنگ سوسائٹی) الہ آباد، مجلس مباحثہ اعظم گڑھ، مجلس مناظرہ اندور، انجمن مباحثہ یا بنارس انسٹی ٹیوٹ بنارس، جلسہ مباحثہ یا ڈبٹینگ سوسائٹی میرٹھ

معاشرتی اصلاح وتہذیبی انجمنیں

انجمن تہذیب لکھنؤ، جلسہ تہذیب لکھنو، مجلس اصلاح معاشرت کانپور، انجمن تہذیب سیتا

پور، انڈین ریفارم ایسوسی ایسن کلکتہ، انجمن تہذیب مظفر پور، انجمن تہذیب کانپور، انجمن رفاہ عام گونڈہ ، انجمن اخلاق علی گڑھ، انجمن اصلاح معاشرت بارہ نگر (کلکتہ)، انجمن فیضان عام گوجرانوالہ، انجمن رفاہ عام اجمیر، انجمن تہذیب بنگلور، انجمن خیر خواہ ملک نور پور، انجمن رفاہ عام حاجی پور، انجمن تہذیب نواب گنج، انجمن فلاح ، اہل اسلام سوہاگ پور، انجمن حق آگرہ خطب سورج پنتھ بمبئی، راجپوتانہ سوشل سائنس کانگریس، انجمن رفاہ خلائق۔

تعلیمی اشاعتی انجمنیں

کمیٹی خواستگاراں ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند۔ بنارس، مدرسہ فوقانیہ مراد آباد۔

خواتین کی اصلاح وتعلیم کی انجمنیں

زنانہ سوسائٹی کلکتہ، بیتھوں سوسائٹی، کلکتہ۔